فیضا فیضا

تعلیم میں انقلاب

نوری نستعلیق

قومی اہمیت کی ایجاد

سفرِ اشاعت

راوی : مرزا احمد جمیل

تحریر کاشف زبیر

کچھ عرصے پہلے سرگزشت میں نوری نستعلیق کی ایجاد کے بارے میں تفصیلات شائع ہوچکی ہیں اور اس حوالے سے مرزا احمد جمیل کا نام بھی اب قارئین کے لئے اجنبی نہیں رہا ہے۔ زیرِ نظر یادداشتیں مرزا صاحب نے ایک انٹرویو کے دوران میں ریکارڈ کرائی ہیں۔ جن سے ایک فن کار اور اس کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور طباعت و اشاعت کے مختلف مراحل کے بارے میں بھی آگاہی ہوتی ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی یادداشتوں کے ذریعے ہمیں تقسیمِ ہند سے پہلے اور بعد کے زمانے کا جو نظارہ کرایا ہے وہ قابلِ دید بھی ہے اور یادگار بھی۔ وہ پیدائشی طور پر ایک آرٹسٹ ہیں اور آرٹسٹ کا بزنس مین بننا ذرا مشکل کام ہوتا ہے مگر وقت آنے پر انہوں نے یہ مشکل کام بھی آسان کر ڈالا۔

نوری نستعلیق کے بانی اور ایک بڑے اشاعتی ادارے کے روحِ رواں مرزا احمد جمیل کی یادداشتیں

نرسری کے علاقے میں شاہراہِ فیصل پر جس عمارت میں سٹی بینک کا دفتر ہے اس کی بغلی گلی میں سیدھے ہاتھ پر تیسرا گھر اس شخص کا ہے جو بڑی خاموشی سے زندگی بسر کررہا ہے۔ بڑا عجیب سا شخص ہے۔ ہر کوئی اس کے بارے میں جانتا ہے لیکن لگتا ہے کچھ نہیں جانتا۔ وہ گھر سے کم نکلتا ہے لیکن جس تقریب میں چلا جاتا ہے، بیاسی سال کی عمر میں بھی بائیس سالہ جوان کی طرح توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ باتوں کا ایسا ظریف کہ ہنسی ہر وقت ہونٹوں پر رہتی ہے۔ دلی کی شستہ زبان میں بولتا ہے تو کان خود بہ خود متوجہ ہوجاتے ہیں۔ وہ گھر سے کم نکلتا ہے لیکن ہر گھر میں اس کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ہر گھر میں پایا جاتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے طباعت شدہ کلینڈرز اور ڈائریوں کی شکل میں۔ ادیبوں کی کتب کی صورت میں، اخبار کی صورت میں جو نوری نستعلیق پر چھپتے ہیں۔ کمپیوٹر پر اُردو کمپوزنگ میں جو اسی شخص کی مرہونِ منت ہے۔ جو اسے جانتے ہیں وہ تو خوش قسمت ہیں ہی لیکن جو اسے نہیں جانتے، ان کی بدقسمتی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ایک بہت بڑے اشاعتی ادارے کا سربراہ جو ایک بڑے سے گھر میں رہتا ہے۔ اس کے گھر کے پورچ میں نصف درجن کاریں کھڑی رہتی ہیں لیکن سادگی ایسی کہ شاید کسی جھونپڑی نشین درویش کو بھی میسر نہ ہوگی۔ باتوں اور رویے سے اتنا سادہ کہ آج کے دور میں خاص لگنے لگا ہے۔ جب وہ بات کرتا ہے اور جب ہنستا ہے تو بے اختیار خواہش اُبھرتی ہے، کاش اسے کبھی موت نہ آئے۔ یہ ہم میں رہے۔ اس کے وجود سے زندگی اور تازگی کا احساس تادمِ آخر ہے۔ ہم اسے مرزا احمد جمیل کہتے ہیں۔

انٹرویو کے بارے میں کہا جاسکتا ہے، یہ ایک بے حد روایتی سی چیز ہے چاہے اسے کتنے ہی غیر روایتی انداز میں لیا جائے۔

کاشف زبیر : آپ اپنی کہانی کا آغاز کہاں سے کرنا پسند کریں گے؟

مرزا صاحب: زندگی کا سفر تو بچپن سے شروع ہوتا ہے اور اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ میرے خاندان کے لئے تبدیلی کا آغاز جنگِ آزادی کی ناکامی سے ہوا۔ میرے پردادا مرزا عبداللہ بیگ کا گوٹا کناری بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ یہ غدر کے بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں اس قسم کے کام کرنے کا تصور بھی نہیں تھا۔ مغل گھرانے صنعت کا کام نہیں کرتے تھے لیکن میرے خاندان والوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ وہ سخت آزمائش کا دور تھا

اور ہم پدرم سلطان بود کے سحر سے نکل آئے تھے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے پردادا کو پیدائش کے وقت بہادر شاہ ظفر کے پاس لے جایا گیا تھا اور انہوں نے ایک اشرفی دی تھی۔ یہ اشرفی خاصے عرصے تک ہمارے خاندان میں رہی پھر نہ جانے کہاں چلی گئی۔ پردادا ذرا اللہ والے تھے۔ لوگ ان کے پاس دم کرانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ہندو آیا اور کہنے لگا، میرا بچہ بیمار ہے چل کر اسے دیکھ لیں۔ انہوں نے کہا میں تو نہیں جاتا۔ اس پر ہندو ان کے پیچھے ہی پڑ گیا۔ جان چھڑانے کے لئے پردادا نے کہا تمہارا گھر کس طرف ہے۔ اس نے بتایا پورب کی طرف ہے۔ دادا جان نے اسی طرف منہ کر کے کچھ پڑھا اور پھونک مار کر کہا جاؤ تمہارا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہندو سمجھا کہ شاید یہ مجھے ٹال رہے ہیں۔ وہ مایوس سا چلا گیا۔ مگر اگلے روز مٹھائی لے کر چلا آ رہا تھا۔ اس کا بچہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تو دم کرانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ دادا مذہبی آدمی تھے۔ لیکن پردادا والی بات نہیں تھی۔ البتہ قرآن حفظ کر لیا تھا اور خود کو درس و تدریس کے لئے وقف کر لیا تھا۔ وہ زیادہ تر سفر کیا کرتے تھے اور دورانِ سفر۔۔۔ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ میرے تایا محمد احمد خوشنویسی کرتے تھے۔ وہ بھی حافظ قرآن تھے۔ رمضان میں خاص طور سے تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ میرے والد نور احمد اتنی اچھی قرأت کرتے تھے کہ لوگوں نے انہیں قاری نور احمد کہنا شروع کر دیا تھا۔ حالاں کہ وہ شوقیہ تلاوت کرتے تھے۔ اسے پیشہ نہیں بنایا تھا۔ یہ سب بیان کرنے کا مقصد واضح کرنا ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول سراسر مذہبی تھا اور والد صاحب کو مصوری کا شوق تھا۔ کہاں دینی ماحول اور کہاں مصوری۔ اسے پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ دن میں وہ یہ کام کر نہیں سکتے تھے لہذا رات کو جب سب سو جاتے تھے تو یہ اپنی ڈرائنگ لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ پنسل اور چارکول سے کام کرتے تھے۔ تایا ان سے سولہ سال بڑے تھے اور باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ دادا کیوں کہ زیادہ تر سفر پر رہا کرتے تھے تو چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال تایا کے سپرد تھی۔ وہ والد صاحب سے کہتے تھے کہ مصوری بالکل نہ کیا کرو اور ایک دو بار انہوں نے والد صاحب کی انگلیوں پر ہلکی سی قمچیاں بھی ماری تھیں۔ مگر یہ چھٹنے والی شے نہیں تھی۔ لہذا ان کے شوق کو خوشنویسی کی طرف موڑ دیا گیا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ خوشنویس منشی محمد دین کے شاگرد بن گئے تھے جو اعلیٰ پائے کے خوشنویس تھے۔ اُردو سندھ مدرسہ ان ہی کے دادا نے قائم کیا تھا۔ والد صاحب نے بہت جلد خوش نویسی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں ہی انہوں نے دلی میں ہونے والے خوشنویسی کے ایک مقابلے میں طغریٰ بنا کر بھیجا۔ لوگ کیوں کہ والد صاحب کو خوش نویس کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے لہذا یہ کسی کو نہیں معلوم ہوا کہ طغریٰ انہوں نے بنایا ہے۔ ججوں نے اس طغرے کو پہلے انعام کا حق دار قرار دیا۔ حالاں کہ مقابلے میں بڑے بڑے استادوں نے شرکت کی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ انعام سولہ سال کے ایک لڑکے کو دے دیا گیا ہے تو بولے ہم نہیں مانتے سولہ سال کا لڑکا ایسا کام کر ہی نہیں سکتا ہے۔ اس پر مقابلے کے سربراہ منشی محمد دین نے کہا۔ اچھا بھئی ایسا کرتے ہیں کہ تم لوگ بھی آؤ اور اس لڑکے کو بھی بلاتے ہیں اور آمنے سامنے مقابلہ ہو جاتا ہے اب جو بھی ایسا کام کرے انعام اسی کا۔ اس پر وہ لوگ کترا گئے۔ کیوں کہ یہ کام اتنا اچھا تھا کہ وہ اس کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

والد صاحب کوئی بیس برس کے ہوں گے جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یہ باہر نکلے۔ ان صاحب نے کہا چلو میرے ساتھ اور یہ چل پڑے۔ چار دن گھر سے غائب رہے جب واپس آئے تو حلیہ خراب تھا۔ کپڑے اور جسم گرد آلود ہو رہے تھے۔ پیر زخمی تھے اور ان میں چھالے بن گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ چار روز تک مسلسل چلتے ہی رہے تھے۔ اتنا ہوش بھی نہیں تھا کہ اپنے زخموں کو ہی محسوس کر لیتے۔ دھوپ سے رنگ جھلس گیا تھا۔ پوچھا کہاں گئے تھے، کہنے لگے کہ مجھے نہیں معلوم بس ایک صاحب لے گئے تھے، ان کے ساتھ ہی چلتا رہا۔ ان کے ساتھ رہا اور وہی مجھے چھوڑ کر گئے ہیں۔ درمیان میں کیا گزری، کچھ معلوم نہیں۔ اس کے بعد سے ان کی کیفیت عجیب سی رہنے لگی تھی بے خود ہو جاتے تھے اور انہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ تایا نے منشی محمد دین سے کہا یہ کام سے جی چرانے لگا ہے اس لئے یہ حرکتیں کرتا ہے تا کہ کام کرنا اور پڑھنا نہ پڑے۔ یہ تو پیر بن گیا ہے۔ منشی محمد دین بولے۔ پہلے تو یہ دوسروں کو بتاتا تھا اب مجھ پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا ہے۔ جب والد صاحب پر کیفیت طاری ہوتی تھی تو آپ جناب کا تکلف اٹھ جاتا تھا۔ استاد ہو یا ساتھی سب کو ایک طرح سے مخاطب کرتے تھے۔ منشی محمد دین سے کہا۔ دیکھ تیرا بیٹا پیرس کے اسپتال میں ہے۔ اس کی آنکھ پر پٹی بندھی ہے۔ اس پر منشی صاحب بولے اب تو بہت ہو گیا۔ بہر حال بات آئی گئی ہو گئی۔ دو

دنیا کے چند نامور پڑھاکو اور حفاظ

تلاش و تحریر: احمد صغیر صدیقی

جارج سین ٹس بری اور اینڈریو لنگ۔۔۔دونوں مصنفوں میں مطالعے کی عادت تھی۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان کے تمام ساتھیوں نے مل کر بھی اتنی کتابیں نہیں پڑھی تھیں جتنی ان لوگوں نے تنہا پڑھ رکھی تھیں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

کہا جاتا ہے کہ لٹریری تبصرہ نگاروں، پبلشرز اور رسائل کے ایڈیٹروں میں بھی تیزی سے پڑھنے کا ملکہ پایا جاتا ہے کیونکہ یہ ان کے پیشے کی ایک اہم ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً جارج سمپ سن، ایس رابرٹ اور ایڈورڈ گارنٹ ایسی ہی شخصیات تھیں۔ یہ لوگ ہفتے میں کوئی بیس ناول پڑھ لیتے تھے۔

حقیقتاً پڑھنے کی تیز رفتاری کا تعلق کچھ تکنیک سے بھی ہوتا ہے اور کچھ آدمی کی ذہنی چستی سے بھی۔ ایسے پڑھنے والے حقیقتاً سطور کے ہر لفظ پر نگاہ نہیں رکھتے۔ وہ پوری سطر کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں مگر تیز رفتار قارئین بہرحال مواد کو یاد نہیں رکھتے۔

جہاں تک قوتِ حافظہ کا تعلق ہے، یہ ایک باطنی صلاحیت ہوتی ہے اور اسے آسانی سے سمجھا نہیں جاسکتا۔ لارڈ میکالے کا نام اس معاملے میں بہت اہم قرار دیا گیا ہے۔ وہ اخبار پڑھ کر اس کی بہت سی سطور کو بہ آسانی اپنے حافظے سے دُہرا دیتا تھا۔ کہتے ہیں، اس کو قدرت سے PHOTOGRAPHIC MEMORY ملی ہوئی تھی۔

مہینے بعد بیٹے کا خط آیا کہ اسپتال میں تھا آنکھ پر چوٹ لگی تھی اب ٹھیک ہوں۔ پیرس میں رہا۔ سب چونک گئے۔ تایا نے سوچا کہ انہیں کسی پیر صاحب کے پاس لے جائیں۔ اس زمانے میں پیر عبدالصمد مشہور تھے۔ بزرگ آدمی تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو دیکھا اور کہا یہ تو اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں کے لئے ہم اتنی محنت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نوازا ہے۔

کاشف زبیر: ان کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟

مرزا صاحب: کبھی کبھی تو بالکل مجذوب ہوجاتے تھے۔ ایک بار پیر عبدالصمد کی بہو کی زچگی میں مسئلہ ہوگیا۔ دو دن ہوگئے تھے بڑی مشکل میں تھیں۔ ان سے کہا تو انہوں نے اپنی تسبیح بھجوادی۔ تسبیح ان کے سرہانے رکھ دی تو بچہ ہوگیا تھا۔ یہ سن کر چاروں طرف سے لوگ آنے لگے تھے۔ والد صاحب اس بھیڑ بھاڑ سے گھبرا گئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ دلی سے کلکتہ چلے گئے۔ یہ 1921ء کی بات ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ میں والد صاحب کے جانے کے تیسرے دن پیدا ہوا تھا۔ کلکتہ میں استاد حسین بخش آرٹسٹ تھے، وہ تھیٹر کے لئے کام کرتے تھے۔ اس زمانے میں تھیٹر کے سین بڑے بڑے پردوں پر بنائے جاتے تھے۔ استاد یہ پردے تیار کرتے تھے۔ ان کے پاس بے شمار شاگرد تھے لیکن جب والد صاحب ان کے پاس گئے تو وہ ان پر سب سے زیادہ توجہ دینے لگے تھے۔ پرانے شاگرد معترض ہوئے کہ ہم تو سالوں سے آپ کے ساتھ ہیں۔ اس پر استاد نے کہا۔ اس میں کام سیکھنے کی جو صلاحیت ہے، وہ میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ یہ کام کرسکتا ہے۔ تو آئل کلر کا استعمال والد صاحب نے ان سے ہی سیکھا تھا۔ بعد میں انہوں نے استاد حسین بخش کی تصویر بھی بنائی تھی۔

استاد حسین بخش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام کے اتنے ماہر تھے کہ ان کے دشمن ان سے جلنے لگے تھے۔ ایک بار انہوں نے غنڈے بھیجے کہ جا کر ان کا دایاں ہاتھ توڑ دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ظاہر ہے اب وہ سیدھے سے کام نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ سے ویسا ہی بلکہ اس سے بھی اچھا کام شروع کردیا۔ اس پر دشمنوں نے کہا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کے فن کا راستہ نہیں روکا جاسکتا۔ اگر ان کا دوسرا ہاتھ بھی توڑ دیا گیا تو عین ممکن ہے یہ پیر سے کام شروع کردیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی بیگم کے مرنے کے تین برس بعد یادداشت کے سہارے ان کی تصویر بنائی تھی۔

جو ہو بہو ویسی ہی تھی۔
والد صاحب کلکتے سے واپس آئے۔ اس زمانے میں دلّی میں پرنٹنگ کی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ دوسرے لوگ ان کے اور ان کے بڑے بھائی کے کام کو صحیح طور پر نہیں چھاپ پا رہے ہیں تو انہوں نے اسے خود شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ والد صاحب نے ایک پتھر کا ہینڈ پریس خرید لیا۔ اس زمانے میں پتھر کے بنے ہوئے پریس ہوا کرتے تھے۔ یہ کوئی دو من وزنی پتھروں پر مشتمل تھا۔ اس کا پہیا گھمانے کے لئے ایک گیم تھیم صاحب عبدالجبار کو رکھا گیا تھا۔ مجھے ان کی صورت اب تک یاد ہے۔ پریس اس کمرے میں لگایا گیا تھا جہاں میری پیدائش ہوئی تھی۔ یہ گھر کا سب سے اچھا اور بڑا کمرا تھا جسے پریس لگانے کے لئے منتخب کر لیا گیا تھا۔ والدہ کو دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یوں ہمارا خاندان اشاعت کی صنعت میں داخل ہوا۔ والد صاحب نے پریس کا نام نور فائن آرٹس پریس رکھا تھا۔ بعد میں انہوں نے ایک ہندو شیوناتھ سے شراکت کر لی تھی کیوں کہ اس نے زیادہ سرمائے سے بڑا پریس لگانے کی پیش کش کی تھی یوں دہلی آرٹ ورکس قائم ہوا۔ شیوناتھ نے چالاکی یہ کی کہ اپنے آدمی والد صاحب کے ساتھ لگا دیئے۔ جب انہوں نے کام سیکھ لیا تو اس نے کہا پارٹنر شپ ختم، اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی ہے۔ لہٰذا والد صاحب نے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے میں بمبئی اور کلکتہ ایسے نام تھے جیسے آج لندن یا نیویارک ہیں۔ دونوں بہت بڑے اور ترقی یافتہ شہر تھے۔ صنعتوں کے لحاظ سے بھی، فنون کے لحاظ سے بھی اور کام کے لحاظ سے بھی۔ بمبئی ایک لحاظ سے چھوٹا ہندوستان تھا۔ بنگال تک سے لوگ چلے آتے تھے۔ اکثریت ....تو مقامی افراد کی تھی۔ گجراتی اور میمن بھی بڑی تعداد میں آباد تھے جو وہاں کاٹھیاواڑی کہلاتے ہیں۔ اتر پردیش، پنجاب اور حیدرآباد دکن کے بھی خاصے لوگ آیا کرتے تھے۔ مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ گجراتی اور کاٹھیاواڑی اہم زبانیں تھیں لیکن اردو سب ہی سمجھتے اور بولتے تھے۔ ماحول اچھا تھا مگر ہندو مسلم فسادات بھی خوب ہوا کرتے تھے۔ فسادات انگریز کراتے تھے کہ بھئی اب دونوں قوموں میں کچھ زیادہ ہی یگانگت ہوگئی ہے اور کچھ رونق ہو جائے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ کسی مسجد کے سامنے سے سؤر کا کٹا ہوا سر ملتا تھا۔ تو بس طے ہو جاتا تھا کہ یہ کسی ہندو کا کام ہے اور فساد شروع ہو جاتا۔ پھر اخباروں میں آتا آج دو ہندو مارے کل تین مسلمان مارے گئے تھے۔ اخبارات حساب کتاب رکھتے تھے اور بلوائی اسکور برابر رکھنے کے لئے قتل کرتے رہتے تھے لہٰذا اخبارات پر پابندی لگا دی گئی تھی کہ وہ ہندو مسلم نہیں لکھیں گے۔ مگر لوگ علاقے سے اندازہ لگا لیتے تھے اگر ہندو علاقہ ہے تو لازماً لاش کسی مسلمان کی ہوگی یا مسلم علاقہ ہے تو ہندو کی ہوگی۔ ہم جس علاقے میں رہتے تھے وہ گول بازار کہلاتا تھا۔ یہ بھنڈی بازار اور گول گلی کا درمیانی علاقہ تھا۔ ہمارے گھر سے ایک دیوار نظر آتی تھی۔ اس کے ایک طرف مسلمان رہتے تھے اور دوسری طرف ہندو آباد تھے۔ کسی کسی روز تو آمنے سامنے لڑائی ہوا کرتی تھی۔ دونوں طرف سے پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ زیادہ تر تو منہ زبانی ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی عملی معرکے کی نوبت آ جاتی تھی۔ ایک آدمی نکلتا اور مخالف پارٹی سے لڑ بھڑ کر واپس آ جاتا تھا۔ لیکن دیواری حد کبھی عبور نہیں کی جاتی تھی۔ بازار میں ہندوؤں کی دکانیں زیادہ تھیں خاص طور سے مچھلی بیچنے والی سب ہندو عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ سب صبح سویرے اپنا کاروبار کر لیا کرتے تھے۔ گیارہ بجے تک سب اپنی دکانیں بند کر کے چلے جاتے تھے پھر فساد شروع ہو جاتے تھے۔ کیا دور تھا کہ ہر شے میں ایک قاعدہ ایک قرینہ تھا۔

کاشف زبیر : گویا فساد بھی اصول کے تحت ہوا کرتے تھے۔

مرزا صاحب : (قہقہہ) ہاں بھئی کچھ ایسا ہی ہوتا تھا۔ بمبئی میں بہت سارے اچھے علاقے تھے۔ کینٹ اور مرکزی بمبئی انگریزوں کا علاقہ تھا۔ وہاں بڑے بڑے دفاتر تھے جن میں سب لوگ جایا کرتے تھے۔ ہندو مسلم دونوں علاقوں سے راستے اسی طرف نکلا کرتے تھے۔ ہم اوپری منزل پر رہتے تھے اور ہمارے گھر سے یہ سب بے حد واضح نظر آتا تھا۔ ایسا بھی دیکھا کہ اسٹاپ پر ایک ہندو کھڑا ہے۔ ایک سپاہی اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ اتنے میں ایک مسلمان آیا، اس نے سپاہی کو باتوں میں لگایا اور دوسرے نے آ کر ہندو کے چھرا گھونپ دیا۔ یا مسلمان ہے تو یہی کام ہندو کر گزرے گویا بچپن سے خون دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اب بھی بقر عید پر بکرے خود ہی ذبح کرتے ہیں (قہقہہ)

کاشف زبیر : آپ کا خاندان بمبئی آ کر کہاں ٹھہرا تھا؟

مرزا صاحب : ہم 1926ء میں بمبئی آئے۔ والد

....صاحب چھ مہینے پہلے آ چکے تھے پھر ہمیں بھی بلالیا۔ ہم دادا کے ساتھ ٹرین سے بمبئی آ ئے۔ اس زمانے میں بمبئی میں ٹراموں کے علاوہ وکٹوریہ چلتی تھی۔ یہ ڈبا نما گھوڑا گاڑی ہوتی ہے جس میں کوچبان خاصی بلندی پر بیٹھتا ہے۔ اس کی بڑی سی سیٹ پر ایک دو افراد اور بھی بیٹھ سکتے ہیں تاکہ کوئی راستہ بتانے والا رہے۔ دادا مجھے لے کر اس کے برابر میں بیٹھ گئے۔ دادا کو اتنا معلوم تھا۔ گول بازار جانا ہے۔ اور انوار اللہ بنیان والے کے گھر جانا ہے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ گول بازار بہت بڑا علاقہ ہے جہاں سیکڑوں عمارتیں ہیں۔ صبح کا وقت تھا دکانیں بند تھیں اور کوئی پتا بتانے والا بھی نہیں تھا۔ جب پتا نہیں ملا تو کوچبان بگڑنے لگا۔ شروع میں تو بڑا چاچا کر رہا تھا پھر اسے غصہ آنے لگا۔ بڑی مشکل سے انوار صاحب کا گھر ملا تھا۔ ہم تین مہینے تک ان کے پاس رہے تھے جب تک کہ ہمیں الگ گھر نہیں مل گیا تھا۔

انوار اللہ صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کا اور ان کی بیگم کا دل ہم بچوں کی وجہ سے لگا رہتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم وہاں سے نہ جائیں۔ اس دور کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ...رات کو سوتے ہوئے کسی بچے کا پیر لالٹین سے لگا اور وہ لحاف پر جا گری۔ سردیوں کے دن تھے۔ آگ لگ گئی۔ جب دھواں پھیلا تو سب کی آنکھ کھلی اور بڑی مشکل سے آگ پر قابو پایا گیا تھا۔ یہ اصل میں ایک فلیٹ تھا۔ اس زمانے میں بمبئی میں فلیٹ وغیرہ کم ہی ہوتے تھے۔ کئی منزلہ عمارتیں ہوتی تھیں جن میں کمرے ہوتے تھے انہیں چالیاں کہتے تھے۔ ہر منزل پر لیٹرین اور غسل خانہ مشترک ہوتا تھا۔ یہ عمارت نئی اور بڑی مضبوط بنی تھی۔ اس کی نچلی منزل پر دکانیں تھیں جن کی چھتیں سولہ فٹ اونچی تھیں اور اوپر کمروں کی چھتیں تو اس سے بھی زیادہ اونچی تھیں۔ اٹھارہ اور بیس فٹ تک کی۔ کمرے بھی بڑے بڑے ہوتے تھے۔ ایک وسیع کمرے میں باورچی خانہ تھا۔ جس کے ساتھ ہی غسل خانہ تھا جو اٹھارہ بائی بیس فٹ کا تھا۔ وہ گھر بہت آرام دہ تھا۔ لیکن ہم زیادہ عرصے یہاں نہیں رہے تھے۔ ابا جان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ ان سے کہا کہ تمہیں بمبئی کا پانی راس نہیں آیا ہے۔ والد صاحب کے دو گاہک تھے۔ منشی قمر الدین اور حافظ غلام محمد۔ یہ ان سے کام کروانے لاہور سے آیا کرتے تھے۔ پرنٹنگ ڈیزائننگ اور سیپریشن کا سارا کام ابا جان کرتے تھے۔ ابا جان نے بمبئی میں آ کر بولٹن آرٹ ورکس کے نام سے پریس قائم کیا تھا۔ طغرے وغیرہ لیتھو پر چھاپا کرتے تھے جو اس زمانے میں جدید ترین ٹیکنالوجی تھی۔ منشی اور حافظ صاحب نے ابا جان سے لاہور چلنے کے لئے کہا۔

اس زمانے میں بمبئی میں مسلمان فنکار چھائے ہوئے تھے۔ ان میں ایک میاں صاحب تھے اور ایک کریم صاحب تھے۔ انہوں نے مصوری میں نام پیدا کیا تھا۔ میاں صاحب مراٹھی تھے۔ ان سے ابا جان کی اچھی دوستی تھی۔ وہ ان کے لئے لیتھو کے ڈیزائن بنایا کرتے تھے۔ حافظ غلام محمد نے کہا کہ لاہور چلو صحت بھی اچھی ہو جائے گی اور کام بھی کرتے رہو گے۔ لہٰذا والد صاحب ہمیں لے کر لاہور چلے آئے۔ **1930**ء میں ہم لاہور آ ئے تھے۔ اور یہاں شاہی مسجد کے پاس ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ اس کا رقبہ تو خاصا کم تھا مگر تین منزلوں کی وجہ سے عمارت میں خاصی گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔ ابا جان نے یہ پوری عمارت کرائے پر لے لی اور اس میں ہمارا سارا ہی خاندان آباد ہو گیا۔ چچا جان اور ان کا خاندان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یہ شاہی مسجد کے بالکل سامنے تھا اور درمیان میں ایک بڑا سا میدان تھا۔ میں **1961**ء میں دوبارہ وہاں گیا تھا جب میں نے بذریعہ سڑک پاکستان کی سیر کی تھی۔ یہ عمارت اس وقت بھی موجود تھی اب معلوم نہیں ہے یا نہیں۔ ابا جان نے دو تانگے والے مقرر کر رکھے تھے۔ جب وہ شام کو کام وغیرہ سے فارغ ہو جاتے تھے تو تانگے والے آ جاتے اور ہمارا پورا گھر سیر کے لئے نکلا کرتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اس لئے تانگوں کے درمیان ریس بھی ہوا کرتی تھی اور ہم بچے شور شرابا کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بڑا مزہ آتا تھا۔

گھر کے سامنے جو میدان تھا وہاں روزانہ شام کو مینڈھے لڑانے والے آتے تھے۔ آپ نے دیکھے ہوں گے ان کے سینگ مڑے ہوتے ہیں۔ ان پر شرطیں لگا کرتی تھیں اور جب یہ آپس میں سر ٹکراتے تھے تو بڑی زوردار آواز آتی تھی جیسے ہی آواز آئی ہم گھر سے نکل کر میدان میں جا پہنچتے تھے۔ مجمع کے بیچ میں گھس گھسا کر تماشا دیکھا کرتے تھے۔ لڑائی ہوتی، لوگ شور مچاتے تھے۔ خوب میلہ ہوتا تھا۔ پتنگ بازی بھی ہوتی تھی اسی دور کا واقعہ ہے، پتنگ کے پیچھے دوڑ رہا تھا کہ بغیر دیکھے ایک گڑھے میں جا گرا، کوئی چار فٹ گہرا تھا اور پیروں کے بل گرا تھا۔ اس وقت تو کچھ محسوس نہیں ہوا۔ مگر رات کو سوجن چڑھنے لگی۔ ہماری اماں نے اس پر ہلدی میں چونا ملا کر لگا دیا۔ سوجن اور درد کے لئے یہ اکسیر ہے۔ کوئی ایک ہفتے تک سوجن اور

تکلیف رہی پھر ٹھیک ہو گئے۔ کسی ایکسرے یا چیک اَپ کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ ساری ڈاکٹری ہلدی چونے سے ہو جاتی تھی۔(قہقہہ)

ہمیں لاہور لانے والوں میں منشی قمرالدین ابا کے اچھے دوست تھے۔ایک دن آئے تو کہنے لگے۔بھئی نوراحمد اتوار کو تمہاری دعوت ہے۔ابا جان کو حیرت ہوئی کہ اس شخص نے پہلے تو کبھی دعوت نہیں کی حالانکہ ہمیں لاہور آئے سال ہو گیا تھا۔پھر وہ دعوت سے ایک روز پہلے آئے۔کہا آپ لوگوں کو آنے میں تکلیف ہوگی۔کھانا میں آپ کے گھر ہی لے آؤں گا۔اگلے روز ڈھیر سارا زردہ اور پلاؤ لئے چلے آ رہے تھے۔بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے محلے میں شادی تھی اور انہوں نے ہماری دعوت بھی کر دی تھی۔(مشترک قہقہہ) اصل میں خاصے کنجوس آدمی تھے۔ان کے برعکس حافظ غلام محمد بہت سلجھے ہوئے اور برد بار قسم کے انسان تھے۔

1933ء میں ہم دوبارہ بمبئی آ گئے۔اس وقت میری عمر بارہ سال تھی اور میں نے خاص تعلیم حاصل نہیں کی تھی ہاں آرٹ کا شوق تھا۔خاص طور سے ڈرائنگ بنانے کا، سارا دن کاغذ اور پنسل لئے بیٹھا رہتا تھا اور شام کو کھیلتا کودتا تھا۔حافظ غلام محمد نے والد صاحب سے کہا یہ لڑکا کام بہت اچھا کرتا ہے لیکن تم اسے تعلیم ضرور دلاؤ۔یہ ان کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے والد صاحب کی توجہ میری تعلیم کی طرف دلائی تھی۔

کاشف زبیر: یعنی اس عمر تک آپ کی باقاعدہ تعلیم شروع نہیں ہوئی تھی؟

مرزا صاحب: ہاں۔میں اپنی تعلیم کے بارے میں بتا دوں کہ جب ہم پہلی بار بمبئی آئے تو پانچ یا چھ برس کی عمر میں مجھے میونسپل اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔وہاں ہیڈ ماسٹر یوسف زئی صاحب تھے۔اسی اسکول میں شرفا کے بچے بھی پڑھتے تھے۔لیکن زیادہ بمبئی کے نچلے طبقے کے بچے پڑھا کرتے تھے۔ان بچوں میں مار کٹائی اور گالی گلوچ بہت فراوانی سے چلا کرتی تھی۔مذہب اور قوم کی بنیاد پر بچوں کے گروپ تھے اب چھ سات کا کاٹھیا واڑی لڑکوں کا ایک گروپ تھا۔وہ اکثر مجھے گھیر لیا کرتے تھے اور مطالبہ کرتے کہ میں ان میں سے کسی سے لڑوں۔ان میں جو سب سے بڑا اور تگڑا لڑکا تھا، وہ آگے آتا تھا۔وہ عمر اور جسامت میں مجھ سے بڑا تھا لیکن جب میں اسے بھی مار لیتا تھا تو وہ سب مل کر مجھے مارا کرتے تھے۔خاصا سخت دور تھا اور میں اسکول کے ماحول سے بے زار تھا۔جب ہم لاہور جا رہے تھے تو مجھے معلوم تھا آج آخری دن اسکول جانا ہے اور کل ہم لاہور چلے جائیں گے۔میں اسکول سے آ رہا تھا کہ راستے میں بدمعاش لڑکوں کا لیڈر مل گیا۔میں نے سوچا آج اسے سبق سکھا ہی دوں۔ہمارے گھرانے میں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی کہ پٹ کر گھر نہ آنا۔

کاشف زبیر: یعنی مغل بچے تھے؟

مرزا صاحب: میں نے اسے پکڑ لیا اور خوب پٹائی لگائی۔وہ خاموشی سے مار کھاتا رہا کہ کل اس نے اسکول آنا ہے تب سب مل کر اسے دیکھ لیں گے۔لیکن اب اسکول کہاں جانا تھا (قہقہہ) اگلے روز ہم لاہور روانہ ہو گئے تھے۔وہاں پر فیروزالدین صاحب نے اسکول بنایا تھا۔یہ مشہور فیروز سنز کے بانی تھے۔مجھے اور بڑے بھائی منظور کو ان کے اسکول میں داخل کرایا تھا۔وہاں ایک استاد تھے۔نام تو یاد نہیں لیکن نو مسلم تھے پہلے عیسائی تھے پھر مسلمان ہو گئے۔ان کی چھوٹی سی داڑھی تھی اور قد بھی چھوٹا تھا۔وہ ہر روز صبح اسکول کے بچوں کو ان کے گھروں سے لیتے ہوئے اسکول آتے تھے۔اب کوئی بچہ کہیں رہتا تھا اور کوئی کہیں یوں اسکول جانے کے لئے دوگنی تگنی مسافت طے کرنی پڑتی تھی۔اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی اور شاید یہی ان کا مقصد بھی ہوتا تھا۔وہ باقاعدہ ہمیں دوڑایا کرتے تھے کہ تیز چلو، تیز چلو۔ان کی عمر اس وقت اکانوے برس تھی یعنی سو میں نو برس کم اور ان کی صحت بہت اچھی تھی۔تمام دانت سلامت تھے معلوم ہوا کہ روز فنائل سے دانت صاف کرتے تھے (قہقہہ) اب کیڑا لگے تو کیسے لگے۔بڑی توجہ اور محبت سے ہمیں پڑھاتے تھے۔چھڑی ساتھ رکھتے تھے لیکن کبھی استعمال نہیں کی۔

لاہور سے بمبئی آئے تو پہلے پہل ہمیں ذکریا مسجد میں داخل کیا گیا۔یہاں مسلمان بچوں کے لئے اسکول بھی تھا۔وہاں تعلیم بہت اچھی تھی خاص بات یہ تھی کہ گجراتی ایک ہندو استاد پڑھاتے تھے۔میں نے وہاں بھی کوئی امتحان نہیں دیا۔اسی سال یعنی **1934**ء میں مجھے سینٹ جوزف ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔اب مسئلہ یہ تھا کہ مجھے گجراتی بالکل نہیں آتی تھی اور ورنیکلر رینک کے لئے گجراتی لازمی تھی۔اسے آج کے چوتھے درجے کے برابر ہی سمجھیے۔میں تعلیم میں ہمیشہ سے تیز تھا تو ایک سال تک گجراتی پڑھنے کے بعد مجھے سینٹ جوزف ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔یہ فرسٹ اسٹینڈرڈ تھا اور چار سال میں، میں نے چوتھا

اسٹینڈرڈ بھی پاس کرلیا۔ موجودہ لحاظ سے یہ مڈل کے مساوی تھا لیکن معیار آج کل کے میٹرک سے بھی اچھا تھا۔ میری تمام تر مروجہ تعلیم اسی اسکول سے ہوئی تھی۔

1938ء میں مجھے جے جے آرٹ اسکول میں داخل کرادیا گیا وہاں فائن آرٹس کے تمام شعبوں میں اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں میں نے سات سال تک تعلیم حاصل کی اور ڈپلوما لیا تھا۔ دراصل تعلیم تو 1943ء میں ہی مکمل ہوگئی تھی لیکن دو سال تک وہاں ورک شاپ کیا تھا۔ یعنی پڑھایا بھی تھا۔ اس وقت تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا اور تعلیم یافتہ لوگ صحیح معنوں میں پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ میرے اکثر ساتھی گریجویٹ تھے۔ میں تعلیم کے معاملے میں ان سے کم نہیں تھا۔ دوسرے آرٹ اسکول میں مجھے ہمیشہ امتیازی پوزیشن حاصل رہی تھی۔

کاشف زبیر: جے جے اسکول آف فائن آرٹ کے بارے میں بتائیے۔

مرزا صاحب: وہاں پر یا تو بہت امیر گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں آتے تھے یا بہت غریب گھرانوں کے۔ متوسط گھرانے کے طلبا شاذ ہی ملتے تھے۔ وہاں اچھے کرسچین اور پارسی گھرانوں کی لڑکیاں آتی تھیں۔ خاص طور سے پارسی خاندانوں میں یہ تھا کہ لڑکی میں ایک ہنر اور آجائے۔ جیسے ڈانس یا موسیقی سیکھتے تھے اس طرح آرٹ بھی سیکھتے تھے، اس سے لڑکی کو اچھا رشتہ ملنے میں آسانی رہتی تھی۔ یوں لڑکیوں کی اکثریت بڑے گھرانوں سے آتی تھی۔ جیسے اکثر لڑکے غریب گھرانے کے ہوتے تھے۔ ایک آدھ ہی امیر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ آرٹ پیسہ کمانے کی چیز نہیں ہے۔ لڑکوں میں ایک ابراہیم عباس مغل تھا۔ اس کا تعلق تو خوجہ گھرانے سے تھا لیکن خود کو مغل کہا کرتا تھا۔ میں نے کبھی پوچھا نہیں بعد میں اس نے سفارت کار کے طور پر پیرس میں انڈین سفارت خانے میں طویل عرصہ گزارا تھا۔ وہ بہترین کپڑے کے لباس میں آتا تھا۔ جاپان سے آنے والا دو گھوڑا بوسکی استعمال کرتا تھا جب کہ ہم لوگ کھدر سے زیادہ نہیں پہن سکتے تھے۔ اس سے بہت ساری چیزیں چھپ جاتی تھیں اور آدمی میں ایک فنکارانہ وضع آجاتی تھی۔ میں کھدر کو ذرا مختلف انداز سے پہنتا تھا کہ اسے کلف کرلیا کرتا تھا۔ اس سے ذرا شان اور بڑھ جاتی تھی۔ لوگ یقین نہیں کرتے تھے کہ میں نے کھدر پہن رکھا ہے۔ بس ایک خرابی تھی کہ کلف لگانے پر یہ بالکل ہی اکڑ جاتا تھا۔

جے جے آرٹ اسکول میں خوب کرکٹ کھیلی اور کرکٹ ٹیم کا کپتان بھی رہا تھا۔ بیڈمنٹن بھی کھیلی تھی لوگ کہا کرتے تھے کہ اسے وقت کہاں سے ملتا ہے۔ یہاں بھی گھس رہا ہے اور وہاں بھی، پڑھ بھی رہا ہے اور کھیل بھی رہا ہے۔ ڈراموں میں بھی حصہ لیتا تھا بلکہ آخری سالوں میں تو ڈرامے لکھے بھی اور ہدایت کاری بھی کی۔ سینٹ جوزف اور جے جے دونوں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ طلبا کی تعلیم کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں میرے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی پڑھتے تھے جنہوں نے آگے چل کر بہت شہرت حاصل کی تھی۔ خاص طور سے سینٹ جوزف اسکول کے دو ساتھی تھے ان میں ایک قاسم چھاپرا تھے۔ وہ نیپال کے اعزازی کونسل جنرل بھی رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ امین نورانی تھے جو پاکستان میں ٹیکسیشن پر بہترین آدمی تھے۔ ان کا تعلق مشہور نورانی خاندان سے ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی زین نورانی بعد میں پاکستان کے وزیر خارجہ بھی بنے تھے۔ اس وقت یہ بہت چھوٹے سے تھے جب ہم کرکٹ وغیرہ کھیلا کرتے تھے تو انہیں باؤنڈری پر بٹھا دیتے تھے تاکہ انہیں چوٹ نہ لگے۔

اسکول میں بڑی ٹیم میں میری شمولیت ایک اتفاق کا نتیجہ تھی۔ اس ٹیم میں سارے ہی بڑے لڑکے تھے اتفاق سے ایک روز فیلڈنگ میں ایک کھلاڑی کم پڑ گیا۔ تو انہوں نے مجھے شامل کرلیا اور سلپ میں کھڑا کردیا۔ بڑی خطرناک پوزیشن ہوتی ہے۔ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا، ایک بال آئی اور سیدھی گھٹنے پر لگی۔ میں نے گھٹنا پکڑا تھا کہ بال ہاتھ میں آگئی۔ انہوں نے کہا اسے کھلایا کرو یہ تو بہت اچھی فیلڈنگ کرتا ہے (قہقہہ) تو وہ حادثاتی شمولیت تھی میری بڑی کرکٹ میں۔ اس کے بعد بیٹنگ بھی کرنے لگے اور بالنگ بھی، فیلڈنگ میں خاص احتیاط کرتے تھے کہ پہلے دن سے نام ہوگیا تھا۔ ہم جس میدان میں کھیلا کرتے تھے، اس کا نام آزاد میدان تھا۔ ایک دن سری لنکا سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب وہاں آئے۔ وہ وہاں کی کرکٹ ٹیم کے مشہور بلّے باز تھے۔ میں جب گیند کراتا تھا تو ایک خاص حربہ استعمال کرتا یعنی بال کو بلے باز کے پیروں کے پاس جو پیر کا نشان ہوتا ہے، اس میں پھینکا کرتا تھا تو بال سیدھی گھوم کر وکٹوں میں چلی جاتی تھی۔ جب وہ کھیلنے آئے تو میں نے یہی حربہ آزمایا اور ان بے چاروں کی وکٹیں اڑ گئیں۔ پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہوگئے بڑے پریشان ہوئے۔ جب دوبارہ کھیلنے آئے تو میں نے پھر یہی ترکیب اختیار کی اور ان کی وکٹیں پھر صاف۔ اسی زمانے میں ہمارے اسکول نے ایک

ٹورنامنٹ جیتا تو اس میں انعام دینے کے لئے جس شخص کو بلایا گیا، وہ وجے مرچنٹ تھے اس زمانے کے مشہور کھلاڑی تھے اور حال ہی میں انڈیا میں جو صدی کے کھلاڑی کا انتخاب ہوا، اس میں بھی یہ شامل تھے۔

کاشف زبیر: جی ہاں اور اس مقابلے میں کپیل دیو منتخب ہوئے ہیں۔

مرزا صاحب: بالکل اسی مقابلے کی بات کر رہا ہوں۔ یہ **1944**ء کی بات ہے جب میں نے وجے مرچنٹ کے ہاتھ سے کپ لیا تھا اور میری یہ حالت تھی کہ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میچ کے دوران میں بلے باز نے جو شاٹ ماری تو بال آ کر سیدھی آنکھ پر لگی۔ میں پاس ہی کھڑا تھا اور ہٹ اتنی تیز تھی کہ مجھے پلک جھپکنے کا وقت بھی نہیں ملا تھا۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو سب لال لال نظر آ رہا تھا، خون بہہ رہا تھا۔ کھلاڑی مجھے سنبھال کر ڈریسنگ روم میں لے گئے۔ اس زمانے میں کرکٹ کے ہر میدان کے ساتھ پویلین ضرور ہوا کرتا تھا۔ مجھے وہاں لے جا کر لٹایا گیا اور میں نے آنکھ کھول کر دیکھی تو چھت نظر آئی دل کو تسلی ہوئی کہ آنکھ بچ گئی ہے۔ کھلاڑی مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ اب کپتان کون ہوگا۔ میں نے کہا وائس کیپٹن کس لئے ہوتا ہے۔ میچ کے بعد دوسری ٹیم والے مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا بڑا خوش قسمت ہے عینک کے شیشے سے آنکھ کے ارد گرد سب کچھ کٹ گیا تھا۔ لیکن آنکھ بچ گئی تھی۔ اس نے پٹی باندھ دی اور میں دوبارہ میدان میں آ گیا۔ اسی حالت میں وجے مرچنٹ سے انعام لیا اور گھر روانہ ہوگیا۔ اس زمانے میں بمبئی میں بڑی اچھی اور آرام دہ ڈبل ڈیکر بسیں چلنا شروع ہوئی تھیں۔ آج بھی ان کی صورت ویسی ہی ہے۔ بڑا اچھا نظام تھا۔ میں ہاتھ میں کپ لئے اور آنکھ پر پٹی باندھے جا رہا تھا تو لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

گھر آیا تو شور مچ گیا کہ دیکھا کرکٹ کے شوق نے اس کی آنکھ کا کام تمام کر دیا۔ یہ آنکھ سے گیا۔ والدہ روتی رہیں جب تک صبح منظور بھائی نے لے جا کر ڈاکٹر کو نہیں دکھایا اور اس نے اطمینان نہیں دلایا کہ آنکھ محفوظ ہے، گھر والوں کو یقین نہیں آیا تھا۔ اس شوق میں مجھے بڑی چوٹیں لگی تھیں اور ویسے بھی خاصی چوٹیں کھائیں۔ میرے پھوپی زاد بھائی سردار علی اچھے ایتھلیٹ اور جمناسٹک تھے۔ خاص طور سے دوڑ میں ان کا شمار بمبئی کے چند اچھے دوڑنے والوں میں ہوتا تھا اور اکثر ریسوں میں وہ پہلا انعام ہی حاصل کرتے تھے۔ وہ روزے سے تھے اور اسی حالت میں محض قوتِ ایمانی کے سہارے چلے گئے اور چوتھے نمبر پر آئے۔ ان سے پیچھے رہنے والے ان سے آگے نکل گئے تھے۔ ان کو جمناسٹک کا بھی شوق تھا۔ عمارت کے اسی حصے میں جہاں سے پانی کے پائپ گزرتے تھے انہوں نے لکڑی لگائی ہوئی تھی اور اس پر جمناسٹک کی پریکٹس کرتے تھے۔ اس وقت میں تیرہ برس کا تھا اور قد کاٹھ کا اچھا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی جمناسٹک کر کے دیکھوں۔ اناڑی تھا۔ پہلی ہی کوشش میں لکڑی ٹوٹ گئی اور میں منہ کے بل فرش پر، ایک دانت تو وہیں گر گیا۔ دوسرا لٹک گیا تھا اور نیچے کے چار دانت بھی ہل گئے تھے۔ اس زمانے میں سن کرنے والی دوا اور پنسلین وغیرہ کچھ نہیں ہوتے تھے۔ بس ٹنکچر آیوڈین ہوتا تھا اسے لگایا۔ ہائیڈروجن پر آکسائیڈ لگایا اور کہا گھر جاؤ۔ اس کے بعد نیچے کے ہلنے والے چاروں دانت بھی ایک ایک کر کے نکال دیئے گئے۔ وہ بھی اس طرح کہ زنبور لگایا اور کھینچ لیے اب آدمی پر جو گزرے۔ اس زمانے میں جوزف ہائی اسکول میں فائنل امتحان ہونے والے تھے۔ اور میں ہمیشہ فرسٹ آیا کرتا تھا۔ میرے بعد جو لڑکا تھا اس کے اور میرے نمبروں میں خاصا فرق تھا۔ اس میں سہ ماہی امتحان ہوا کرتے تھے اور مہینے کے مہینے ٹیسٹ ہوا کرتے تھے اب جو مجھے چوٹ لگی تو اس لڑکے نے سوچا کہ یہ تو گیا۔ بستر پر پڑا ہے پڑھائی خاک کرے گا، پوزیشن کہاں سے لائے گا اب تو اسے پیچھے چھوڑ ہی دوں گا۔ میں نے کوئی آٹھ دس دن پڑھائی کی اور جب امتحان ہوا میں ایک بار پھر اول آیا۔ حالانکہ اس نے بڑی محنت کی تھی۔ ایک بات تھی کہ اسکول میں ہم مسلمان لڑکے عمروں میں بڑے ہوا کرتے تھے کیوں کہ کرسچین لڑکے جو تھے وہ خاصی کم عمری میں اسکول میں آ جاتے تھے۔

میں بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ بڑے بھائی منظور مجھ سے سات سال بڑے تھے۔ ان سے چھوٹے ظہور احمد چار سال بڑے تھے۔ ان کے علاوہ بھی ایک بھائی خلیل احمد تھے جو بچپن میں انتقال کر گئے تھے۔ منظور احمد آرٹسٹ تھے اور آج کل سرکاری دفاتر میں قائداعظم کی جو تصویر آویزاں کی جاتی ہے، وہ ان ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ بھائی ظہور کا آرٹ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پہلے انہوں نے سرکاری نوکری کی۔ اس کے بعد برما شیل میں آ گئے تھے اور آخر میں میرے ساتھ ایلیٹ میں آ گئے تھے۔ بہنیں ساری چھوٹی ہیں۔ مسرت جہاں، ثروت جہاں اور نصرت جہاں،

ہمارے خاندان میں افراد عام طور سے طویل عمر پاتے ہیں۔ 1983ء میں ظہور بھائی کا انتقال ہوا اور اسی سال منظور بھائی بھی وفات پا گئے۔ اباجی 1966ء میں بہتر سال کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔ والدہ کا انتقال 1987ء میں نوّے برس کی عمر میں ہوا۔ تایا نے اٹھاسی برس کی عمر میں وفات پائی تھی۔ چچا کا انتقال بانوے برس کی عمر میں ہوا۔ دادا کا انتقال بھی خاصی عمر میں ہوا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ہمارے خاندان کے لوگ اسّی نوّے برس کی عمر پاتے ہیں خود میں اکیاسی برس کا ہوں۔

کاشف زبیر: مرزا صاحب جے جے آرٹ اسکول کے بارے میں کچھ بتائیے۔

مرزا صاحب: آرٹ اسکول کا شمار بمبئی بلکہ ہندوستان کے بہترین فائن آرٹس انسٹی ٹیوٹس میں ہوتا تھا اور یہاں بہت سارے نامور آرٹسٹوں نے تعلیم حاصل کی، اس سے اس کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نہ جانے کس وجہ سے مجھے اس اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہندو، کرسچین اور پارسی چھائے ہوئے تھے۔ مجھ سے پہلے اس کے اول انعام کو کسی مسلمان نے حاصل نہیں کیا تھا۔ یہ مقابلہ ایک لڑکی ڈولی مکرجی کے نام پر اس کے والدین نے شروع کیا تھا اور اس میں اول انعام چھ سو روپے کا تھا۔ خاصی بڑی رقم تھی۔ اسے آپ ایک کلرک کی سال بھر کی آمدنی کے برابر سمجھیے۔ مقابلے میں عام طور سے چالیس پچاس طلبا شامل ہوتے تھے مگر اجازت صرف آٹھ دس کو ملتی تھی۔ ان کی ڈرائنگ کی بنیاد پر۔ مقابلے میں دو ہفتے کے وقت میں ایک میورل پینٹ کرنی ہوتی تھی۔ خاصی بڑی ہوتی تھی آٹھ بائی چار فٹ کی۔ میورل سب کے سامنے بنائی جاتی تھی اور کوئی شخص کسی سے مدد نہیں لے سکتا تھا۔ کام کے اوقات صبح سے شام تک کے تھے۔ میں نے اسے بنانا شروع کیا اور دو دن پہلے مجھے خیال آیا کہ اس کا جو بیک گراؤنڈ ہے، وہ سفید ہے اگر اسے بدل دیا جائے اور پوری ڈرائنگ کے اوپر ایک ٹیکسچر بنا دیا جائے۔ اس سے مراد ہے کہ پس منظر میں کوئی خاکہ آ جائے۔ یہ سفید نہ رہے۔ میں نے ایک ڈل سا رنگ کیا۔ اب جو میرے ساتھی تھے انہوں نے کہا یہ تو ہمت ہار گیا۔ یعنی جس سے سب سے زیادہ خطرہ تھا، وہ ٹل گیا۔ دوسرے دن آ کر میں نے اسی پر برش سے کام شروع کیا۔ یہ آسان تھا لیکن اس سے اچھا کام وہی لے سکتا ہے جسے اس پر مکمل قابو ہو اور میرا یہ حال تھا میں نصف انچ چوڑا اسٹروک بھی اسی کی مدد سے لگا دیتا تھا۔ اس سے میورل تیزی سے بننے لگی تھی۔ تو شام تک میں نے اسے مکمل کر لیا اور ابھی ایک دن باقی تھا۔ اب باقیوں کی حالت خراب ہونے لگی۔ میں نے جو تکنیک اختیار کی تھی، وہ ان کے بس سے باہر تھی۔ کل تک جو میورل بدرنگ نظر آ رہی تھی، ایک دم نکھر گئی۔ وہ لوگ موٹی اور باریک پنسلوں سے لائن لگا رہے تھے۔ اگلے روز میں نے فنشنگ ٹچ دیا اور ججوں کے سامنے رکھ دیا۔ اس مقابلے میں تصویر پر نام لکھنا منع تھا لیکن جج سارے ہی ہندو یا عیسائی تھے اور اردو سے ناواقف تھے لہٰذا میں نے چھ انچ بڑا اپنا نام بھی اس طرح لکھ دیا کہ وہ میورل کا ایک حصہ لگنے لگا تھا۔

اب ہوا یہ کہ غلام محمد صاحب جو بعد میں پاکستان کے وزیرِ خزانہ اور گورنر جنرل بھی بنے، وہ کالج کے پرنسپل کے چارلس کے بہت اچھے دوست تھے۔ اس زمانے میں وہ حیدرآباد دکن میں وزیرِ خزانہ تھے اور جب بھی بمبئی آتے تھے، کے چارلس کے پاس ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ کے چارلس انہیں انگزی بیشن دکھانے لایا۔ اب سیڑھیوں کے سامنے ہی ہال میں جو تصویر لگی تھی، وہ میری تھی۔ غلام محمد نے اس پر نظر پڑتے ہی کہا۔ یہ تو جمیل نے بنائی ہے۔ چارلس حیران ہوا کہ اسے کیسے معلوم ہوا، انہوں نے بتایا کہ یہ دیکھو نام لکھا ہے۔ اتنا بڑا۔ غلام محمد صاحب نے مروا دیا تھا (قہقہہ) خیر گزری کہ ججوں نے اس پر توجہ نہیں دی اور پہلا انعام مجھے دیا۔ جو اسکول کی تاریخ میں پہلا انعام تھا جو کسی مسلمان کو دیا گیا تھا۔ اس پر جو غیر مسلم لڑکے تھے انہوں نے خاصا شور مچایا تھا کہ انعام ایک مسلمان کو کیوں دے دیا۔ لیکن میری میورل اتنی اچھی تھی کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اب مجھے انعام ملا تو جس عمارت میں ہمارا فلیٹ تھا، وہاں رہنے والوں نے میرے اعزاز میں ایک تقریب کی۔ انہوں نے بلایا۔ چائے وائے پلائی اور مجھ سے کہا کہ میں نے جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کے بارے میں بتاؤں۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے لوگوں کے سامنے تقریر کرنا پڑی تھی۔

نعمان احمد: اور اس وقت آپ کی کیفیات کیا تھیں؟

مرزا صاحب: ظاہر ہے میں اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ شروع میں ذرا گھبرا گیا تھا۔ مگر بعد میں ذرا سنبھل گیا تھا اور یہ تقریب بہ خیر و خوبی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے بلاشبہ ہزاروں تقریبات میں شرکت کی لیکن یہ یادگار تقریب ہمیشہ میرے ذہن میں رہی۔ میرے گھبرانے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی کیوں کہ جوزف ہائی اسکول کے دور میں، میں ڈراموں میں حصہ لیتا رہا تھا۔ لہٰذا مجھے لوگوں کے سامنے

آنے اور یاد کیے ہوئے جملے بولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی ہاں جب ایسے ہی بولنا پڑا تو گھبراہٹ ذرا دیر کے لئے طاری ہوگئی۔

کاشف زبیر: اداکاری بھی مصوری کی طرح آپ کی خاندانی روایات کے خلاف تھی؟

مرزا صاحب: آپ نے بالکل درست کہا۔ یہ بات ہمارے خاندان میں شامل نہیں تھی۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ جب آپ ایک انگریزی اسکول میں پڑھتے ہیں تو وہاں کے ماحول اور اساتذہ آپ پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ آپ سے کہتے ہیں کہ یہ ڈرامے کے چار کردار ہیں ان میں سے ایک تمہیں ادا کرنا ہے تو آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ اسکول کے نصاب اور تربیت میں شامل تھا۔ لہٰذا خاندانی روایات نہ ہونے کے باوجود مجھے یہ سب کرنا پڑا تھا۔ خوش قسمتی سے گھر والوں نے اعتراض نہیں کیا۔

نعمان احمد: اس دور کا کوئی یادگار واقعہ؟

مرزا صاحب: (ہنستے ہوئے) ہاں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک ڈرامے میں دو طالب علم تھے۔ ایک سنجیدہ اور پڑھاکو یہ کردار مجھے دیا گیا تھا کیوں کہ میں پڑھنے میں تیز تھا۔ اور دوسرا کردار اس لڑکے کا جو کھلنڈرا اور شرارتی تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ یہ کردار ایک ایسے لڑکے کو دیا گیا تھا جو سچ مچ کھلنڈرا اور پڑھنے کے معاملے بے پروا تھا۔

کاشف زبیر: یعنی کردار اصلی ہوگئے تھے۔ (قہقہہ)

مرزا صاحب: ہاں اور جب اس نے جملہ کہا کہ تم تو اس لئے فرسٹ آتے ہو کہ استادوں کو رشوت دیتے ہو۔ تو اس پر ہال میں تالیاں بجنے لگی تھیں اور میں کچھ دیر کے لئے اپنی لائنیں بھول گیا تھا۔ لیکن صرف تھوڑی دیر کے لئے۔ ایک بار سیزر پر ڈراما ہوا تو اس میں سیزر کا کردار میں نے ادا کیا تھا۔ میں ذرا نارمل قسم کا اداکار تھا۔ یہ اساتذہ تھے جو طلبا سے ڈرامے کروانے میں پیش پیش رہا کرتے تھے کیوں کہ جس کا گروپ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا تھا، اس کی واہ واہ ہوجاتی تھی۔ ہمارے اسکول میں خواتین ٹیچرز زیادہ تھیں اور وہ سرگرم بھی زیادہ رہا کرتی تھیں۔ جب جے جے آرٹ اسکول میں گئے تو وہاں بھی ڈراموں سے واسطہ پڑا تھا۔ وہاں نہ صرف اداکاری کرنا پڑتی تھی بلکہ ڈراما لکھنا اور اسے ڈائریکٹ بھی کرنا پڑتا تھا۔ ہم اپنے ساتھی بھی خود منتخب کرتے تھے۔ اب سب کی کوشش ہوتی تھی کہ اچھی لڑکیاں اس کے گروپ میں آجائیں۔ دو روز کا اسٹوڈنٹس فیسٹیول ہوا کرتا تھا۔ جس میں آرٹ کی نمائش اور ٹیبلو وغیرہ ہوا کرتے تھے۔

جے جے اسکول آف آرٹ کے بارے میں یہ بتا تا چلوں کہ یہاں مسلم طلبہ اتنے کم تھے کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے اور لڑکی تو صرف ایک تھی۔ مس مرچنٹ خوجہ برادری سے تعلق رکھتی تھی۔ باقی سب پارسی، ہندو اور کرسچین لڑکیاں تھیں۔ ان کا مقصد صرف ایک ہنر کا حصول تھا۔ وہ اسے پیشے کے طور پر نہیں اپناتی تھیں۔ لڑکوں میں سوائے ابراہیم عباس مغل کے سب ہی متوسط گھرانے کے تھے۔ میں اس کا پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ مالی حیثیت اور مذہب سے ہٹ کر وہاں وہی لڑکے مقبول تھے جو اچھا کام کرتے تھے۔ خاص طور سے لڑکیاں سیکھنے کی امید میں ان کے اردگرد رہا کرتی تھیں۔ اس طرح جو لڑکے ڈرامے وغیرہ لکھا اور کیا کرتے تھے، لڑکیاں انہیں بھی گھیرے رہتی تھیں کہ اچھے کردار انہیں ملیں۔ اس کے لئے لڑکیوں میں آپس میں خوب مقابلہ ہوتا تھا۔

جے جے آرٹ اسکول کی طرف سے ہم متعدد بار پکنک اور مطالعاتی دوروں پر بھی گئے تھے۔ ان میں اجنتا اور ایک اور مقام ہے ایلورا اس کے دورے اہم تھے۔ ایلورا کے مقام پر جنوبی ہند میں ایک ہی چٹان کو تراش کر ایک بہت بڑا مندر بنایا گیا ہے جو اوپر سے بنانا شروع کیا گیا اور اسے نیچے تک لائے۔ یہ چھ منزلہ مندر تھا جس کی ہر منزل پر نقاشی کے اعلیٰ نمونے بنائے گئے تھے۔ مندر کے اندر دیواروں پر میورلز بنائی ہوئی تھیں، ہم ان کے مطالعے کے لئے جاتے تھے۔ ایسے شاہکار صرف مذہبی عقیدت مند ہی بنا سکتے ہیں۔ اس مندر کی تعمیر میں سیکڑوں برس لگے تھے۔ ہم جہاں ٹھہرے تھے وہاں سے غاروں تک راستہ بے حد خراب تھا اور صرف بیل گاڑی جاتی تھی۔ یہ اجنتا کے غاروں کی بات ہے۔ ہم سکندر آباد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بیل گاڑی کا سفر اتنا خراب بھی ہوسکتا ہے یہ مجھے اس روز معلوم ہوا تھا۔ بیل بے چارے اس راستے پر بڑی مشکل سے گاڑی گھسیٹ رہے تھے۔ ہم کبھی دائیں لڑھکتے تھے اور کبھی بائیں، کبھی آگے اور کبھی پیچھے بڑی ہمت چاہیے تھی۔ صبح جاتے تھے اور شام کو واپس آتے تو بدن کے جوڑ کھل چکے ہوتے تھے۔ زبردست تجربہ تھا۔ وہ وقت ساری عمر یادگار رہا۔

اسی طرح بمبئی کے نزدیک ساحل پر الوینٹا کے غار تھے۔ ان پر پانی آجاتا تھا اور جب یہ پانی اترتا تھا تو لوگ ان غاروں میں جاتے تھے۔ کشتی کے ذریعے غار تک جاتے

تھے ان میں اندر بڑی اچھی نقاشی کی گئی تھی۔ ایک روز ہم وہاں گئے۔ میں خشکی سے لوگوں کی کشتی میں بیٹھنے میں مدد کررہا تھا۔ میرا ایک پیر کشتی میں تھا اور دوسرا ہوا میں معلق اچانک ایک لہر آئی۔ میرا توازن بگڑا اور میں پانی میں۔ خیر تیرنا آتا تھا اس لئے بچت ہوگئی لیکن کپڑے سب بھیگ گئے تھے اور سردی بہت غضب کی تھی۔ پانی خاصا ٹھنڈا تھا۔ لیکن جوانی کا زمانہ تھا اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں اس لئے برداشت کرگئے۔ میں نے گیلے کپڑے اتار کر سوکھنے کے لئے ڈال دیئے۔ ایک ساتھی نے اپنا اوورکوٹ مجھے دے دیا تھا اور اس میں میری تصویر کھینچی۔ وہ تصویر بھی یادگار کی حیثیت اختیار کرگئی تھی کیوں کہ میں اوورکوٹ پہنے پہلی قطار میں تھا اور اس لمحے کسی نے مجھے آگے کھینچا تھا۔ اسی لمحے فوٹو گرافر نے تصویر لے لی۔ اب میں آگے کی طرف جھکا ہوا تھا اور دوسرے مجھے سنبھال رہے تھے۔

نعمان احمد: (شرارت سے) تو آپ کے اردگرد بھی لڑکیاں جمع رہتی تھیں۔ تو کوئی لطیف واقعہ پیش نہیں آیا؟

مرزا صاحب: (ہنس کر) ہاں بعض لوگ کہتے تھے کہ راجا اندر بنا رہتا ہے کیوں کہ ایک وقت میں کلاس میں جتنی بھی لڑکیاں تھیں، وہ سب کی سب چاروں طرف سے گھیرے رہتی تھیں۔ لیکن میں ان کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوا کیوں کہ میری زیادہ توجہ اپنی تعلیم پر رہا کرتی تھی۔ حالانکہ ان میں بعض ایسی تھیں کہ میں ذرا بھی حوصلہ افزائی کرتا تو ممکن ہے کہ زندگی کی ساتھی بن جاتیں۔ یہ زیادہ تر پارسی لڑکیاں تھیں جو مجھے پسند کرتی تھیں۔ مگر جب آپ کے ذہن میں ایک راستہ اور ایک منزل طے ہوجاتی ہے تو آدمی ادھر ادھر نہیں دیکھتا۔

کاشف زبیر: اس زمانے میں انگریزوں کے سائے میں خاصی آزادی تھی۔ خاص طور سے بمبئی میں خواتین کے حوالے سے کیا صورت حال تھی؟

مرزا صاحب: بمبئی کی زندگی دو بلکہ تین حصوں میں تقسیم تھی ایک تو مسلمان تھے۔ ایک ہندو اور تیسرے پارسی و کرسچین تھے۔ یہ تیسرا طبقہ سب سے آزاد خیال تھا، ان کی تو لڑکیوں کو بھی ٹام بوائے کہا جاتا تھا۔ وہ کسی بھی کام میں جھجک محسوس نہیں کرتی تھیں۔ ہندوؤں میں بھی آزاد خیالی تھی اور ان کی عورتیں اور لڑکیاں ہر ایک سے کھل مل جاتی تھیں۔ ان میں پردے کا رواج نہیں تھا۔ مسلمانوں میں سوائے خوجوں کے کسی میں سخت پردے کا رواج نہیں تھا۔ ہمارے خاندان میں بھی برقع پہنا جاتا تھا لیکن کٹر پن نہیں تھا بلکہ اس زمانے میں مسلمان عورتوں میں یہ رواج تھا کہ وکٹوریہ میں کہیں جاتے ہوئے عقبی پردہ اٹھا دیا کرتی تھیں تاکہ باہر کا نظارہ کرسکیں اور باہر والے بھی انہیں دیکھا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر بمبئی کا ماحول آزاد ہونے کے ساتھ شائستہ بھی تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں ملا کرتے تھے۔ وقت گزاری ہوتی تھی۔ محبت کا چکر بھی چل جاتا تھا۔ اکٹھے فلم دیکھنے جاتے تھے۔ ہمارے آرٹ اسکول کے برابر میں کالج تھا۔ جہاں کے آڈیٹوریم میں ہر ہفتے کو فلم دکھائی جاتی تھی۔ اچھی فلم اور کرایہ صرف چار آنے ہوتا تھا لہٰذا ہفتے والے دن اکثر کلاس برابر والے کالج میں پائی جاتی تھی۔ (قہقہہ) کبھی ہم بھی چلے جاتے تھے۔

نعمان احمد: آرٹ کے حوالے سے آپ کو اکثر ایسی چیزوں سے واسطہ پڑتا ہوگا جو ہماری ثقافت اور مذہب سے ہٹ کر ہوتی ہیں جیسے عریانیت یا جنسی تو آپ کو کبھی پریشانی محسوس ہوئی؟

مرزا صاحب: آرٹ اسکول کے تیسرے سال سے ہم نے نیوڈ... پرمبنی کلاسیں لینا شروع کردی تھیں یعنی ہم عریاں ماڈلز کو پینٹ کیا کرتے تھے۔ مرد کو تو پھر بھی جانگیہ پہنا دیا کرتے تھے لیکن عورت کو یہ بھی نہیں ملتا تھا۔ اب ہمارے لئے یہ عام سی بات تھی بعض اوقات تو نیوڈ کلاس ہفتے بھر تک چلا کرتی تھیں۔ صبح سے شام تک ہم ماڈلز پر کام کرتے رہتے تھے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ درمیان ماڈل بیٹھی ہے اور اس کے چاروں طرف ہم ہیں جو اسے ہر زاویے سے پینٹ کررہے ہیں۔ نہ وہ محسوس کرتی تھی اور نہ ہم محسوس کرتے تھے اس کو جیسا پوز دیا جاتا ویسے ہی بیٹھی رہتی تھی۔ ہر گھنٹے کے بعد اسے دس پندرہ منٹ کے لئے آرام دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ آکر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی سینئر لڑکوں سے کہا جاتا تھا کہ اسے پوز دینے میں مدد دیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ طلبا میں جو جھجک ہے وہ ختم ہوجائے کیوں کہ فحاشی اور عریانیت میں فرق ہوتا ہے۔ وہ ہمارے ذہنوں میں سے یہ چیز نکال دینا چاہتے تھے۔ کیوں کہ طلبا میں لڑکے لڑکیاں سب ہی ہوتے تھے اور ان میں کوئی بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس طرح اسکول کی طرف سے اناٹومی کی کلاسوں میں جاتے تھے۔ وہاں پر بھی عریاں جسموں کی وضاحت کی جاتی تھی۔ تو مجھے یاد ہے کہ شاید ہی کبھی میں نے اسے غلط معنوں میں لیا ہو۔

کاشف زبیر: یعنی جنس آپ کے لئے مسئلہ نہیں بنی؟

مرزا صاحب: نہیں۔ آپ نے میرے 1933ء کے

بنائے ہوئے اسکیچز دیکھے ہیں۔ اس وقت میری عمر صرف بارہ برس تھی جب میں نے بنائے تھے۔ گھر میں سب کے درمیان بیٹھ کر بناتا تھا۔ اماں جان بھی ہوتی تھیں اور بہنیں بھی۔ وہ اسے آرٹ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ یہ کیا بنا رہا ہے اور کیوں بنا رہا ہے لیکن پاکستان آ کر سب کچھ بدل گیا، لوگ اسے برا سمجھنے لگے تھے۔

کاشف زبیر: ایک زمانہ تھا جب آرٹ کا آغاز اسی سے ہوتا تھا؟

مرزا صاحب: ہاں لیکن درمیان میں سب بدل گیا تھا۔ خاص طور سے ضیا الحق صاحب کے زمانے میں سب پر پابندی لگادی گئی تھی لیکن اب ہوتا ہے۔ نیشنل کالج آف آرٹس اور کچھ اور جگہوں پر بھی نیوڈ کی کلاسیں شروع ہوگئی ہیں۔

نعمان احمد: کبھی آپ کے والد یا کسی اور بڑے نے اس پر اعتراض کیا؟

مرزا صاحب: نہیں میں یہ واضح کردوں کہ ہمارا گھرانہ آغاز سے بے حد مذہبی تھا۔ ابا جان آرٹسٹ تھے۔ ان کا جو حلقۂ احباب تھا اس میں ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ وہ خود مجھے صبح کام دے کر جاتے تھے اور شام کو آ کر اسے دیکھا بھی کرتے تھے کہ وہ عریانی کو فن کے طور پر لیتے تھے۔ اس میں مذہب کو درمیان میں نہیں رکھتے تھے۔

کاشف زبیر: مذہب اور فن کے حوالے سے ایک سوال آتا ہے کہ ہمارا معاشرہ اور تہذیب جس دین سے منسلک ہے وہ آرٹ و فن پر بھی پابندی لگاتا ہے کہ یہ کام آپ نہیں کرسکتے تو کیا اس کا فائدہ ہمیں دوسرے شعبوں میں نہیں ہوا؟ جیسے مصوری سے منع کیا گیا تو فن کار خطاطی اور خوشنویسی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

مرزا صاحب: اسے نئی چیز تو نہیں کہا جاسکتا لیکن میں تمہاری بات سے اتفاق کروں گا ممکن ہے اگر مسلمانوں کو تصویر بنانے کی اجازت مل جاتی تو وہ خطاطی اور خوشنویسی میں اتنا آگے نہ جاتے۔ ایسا نہیں تھا کہ تصویروں پر بالکل ہی پابندی تھی اب مغل منی ایچرز ہیں تو ان میں انسانوں کی تصاویر بھی ہیں اور جانوروں و پرندوں کی بھی۔ یعنی مغلوں نے اسے اس طرح بھی نہیں دبایا کہ تصویر بالکل ہی نہیں بنی چاہئے۔

کاشف زبیر: اورنگ زیب عالمگیر کے دور کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

مرزا صاحب: ایسا نہیں ہے۔ اورنگ زیب کے دور کی تصاویر موجود ہیں جن میں اسے عدالتوں میں دکھایا ہے۔ اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ان کے دور میں بنی یا بعد میں ان کے جانشینوں نے بنائی تھیں۔ اسی زمانے میں خاص طور سے استاد منصور کے ہاتھ کی بنی ہوئی پرندوں کی تصاویر موجود ہیں۔

کاشف زبیر: آپ کی طالب علمی کا دور برصغیر میں سیاسی لحاظ سے بے حد سرگرم دور تھا۔ حصول پاکستان کی تحریک عروج پر تھی۔ اس دوران میں آپ کے ساتھ کوئی خاص واقعہ پیش آیا؟

مرزا صاحب: میری تعلیم جے جے آرٹ اسکول میں **1943** ء تک جاری رہی تھی۔ شاید **1942** ء میں گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑ دو کی مہم شروع کی اور کانگریس نے ہر شے کا بائیکاٹ کردیا۔ کالج نہ جاؤ، اسکول نہ جاؤ۔ ملازمت پر نہ جاؤ۔ جے جے آرٹ اسکول میں بھی لڑکوں نے ہڑتال کی تو ہم مسلمانوں پر بھی دباؤ ڈالا کہ کلاسوں کا بائیکاٹ کریں اب چار پانچ سو میں ہم کل آٹھ دس مسلمان تھے۔ لہٰذا ہم انجمن اسلام کے ہائی اسکول گئے۔ جہاں نواب بہادر یار جنگ بھی ٹھہرے ہوئے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ وہ وہاں موجود ہیں۔ ہم نے جا کر کہا کہ ہمارا ایک مسئلہ ہے ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے فوری طور پر بلوالیا کہ آئیے اور بتائیے کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے۔ میں نے کہا سارے ہندو کہتے ہیں کہ کل سے اسکول نہ آنا اور ہم تعداد میں بہت کم ہیں۔ انہوں نے کہا تعداد کی بات نہ کرنا۔ ہمیں قائداعظم نے حکم دیا ہے کہ ہم بائیکاٹ نہیں کریں گے اور اس تحریک میں کانگریس اور گاندھی جی کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اس لئے آپ بائیکاٹ نہیں کریں گے۔ آپ کل کلاسوں میں جائیے اور ضرور جائیے۔ کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تو ہم اگلے روز کلاسوں میں گئے۔ اب پورے اسکول میں سوائے ہم مسلمانوں کے کوئی طالب علم نہیں تھا اور ملازم کیوں کہ انگریزوں کے تھے وہ آنے پر مجبور تھے۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد تحریک کا زور ٹوٹ گیا اور طلبہ واپس آنے لگے۔ کسی نے ہم سے کچھ نہیں کہا۔ عملی سیاست کا بس اتنا ہی تجربہ تھا۔ باقی ہمارے گھر میں سیاسی حضرات کی آمد جاری رہتی تھی۔ مولانا حبیب احمد ندوی صاحب کا اخبار تھا ''ہندوستان ویکلی'' وہ ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ اسی طرح سروش اخبار کے مالک منشی وسیم الدین بھی آتے تھے۔ شادی کی اکثر محفلوں میں ابا جان کے اور دوستوں کے ساتھ وہ بھی شریک ہوتے تھے۔

ان اخبارات کا خاصا کام ابا جان کیا کرتے تھے۔ زاہد علی جو مولانا شوکت علی کے صاحبزادے تھے، ان سے ندوی صاحب کے اچھے تعلقات تھے اور ان کا خلافت ہاؤس میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے مسلمان ٹھہرا کرتے تھے۔ آرٹسٹ شاکر علی، زاہد علی کے رشتے دار لگتے تھے۔ وہ بعد میں بڑے نامور آرٹسٹ اور لاہور نیشنل آرٹ کالج کے پرنسپل بھی رہے تھے اور ان کا شمار جے جے آرٹ اسکول کے ہونہار ترین طلبہ میں ہوتا تھا۔ جب وہ داخلے کے لئے بمبئی آئے تو ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح داخلے کی بات کریں۔ اس پر مولانا ندوی نے کہا جمیل سے کہو وہ جے جے آرٹ اسکول میں ہے۔ لہذا مجھے خلافت ہاؤس میں بلایا گیا اور کہا گیا کہ ان شاکر علی کو اسکول میں داخل کرانا ہے۔ اب میں نے جو دیکھا تو ایک نہایت اپ ٹوڈیٹ انگریز قسم کے صاحب کھڑے ہیں سوٹ بوٹ میں۔ مجھے خیال آیا کہ یہ تو نہیں چلیں گے۔ مگر انہیں لے گیا اور امتحان کے بعد انہیں داخلہ مل گیا کیونکہ باصلاحیت آدمی تھے اس لئے خوب ترقی کی۔ میری ان سے بڑی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ ان کا خرچ ان کے والد ساجد علی برداشت کرتے تھے جو اس وقت انڈین حکومت میں سیکریٹری تھے اور خاصی حیثیت کے آدمی تھے۔ شاکر علی نے بمبئی میں بائی کلا کے علاقے میں ایک فلیٹ لیا تھا۔ جو بعد میں ہم لوگوں کا اڈا بن گیا تھا۔ وہاں ہم کام کرتے تھے تاش کھیلتے تھے اور تفریح کرتے تھے۔ اس کی جو چابی تھی وہ ہم کھڑکی کے اوپر پینل پر رکھ جاتے تھے۔ اب جو بھی آتا اور اگر کوئی فلیٹ میں موجود نہ ہوتا تھا تو وہ چابی کی مدد سے اندر چلا جاتا تھا۔ اگر اس کا کام کرنے کو دل چاہ رہا ہوتا تھا تو کام کرتا تھا۔ فلیٹ میں ایک اسٹوڈیو اور ایک ورکشاپ بھی تھی۔ آپ نے جناب لطف اللہ خان کا نام سنا ہوگا۔ ان کے پاس دنیا بھر کی آوازوں کا ذخیرہ ہے۔ ہندوستان کے نامور موسیقاروں، شاعروں اور سیاست دانوں کی آوازیں ریکارڈ تھیں، ان سے بھی میری پہلی ملاقات اسی زمانے میں یعنی 1944ء میں ہوئی تھی۔ ایک عطیہ فیضی رحمین تھیں۔ یہاں پر ان کی آرٹ گیلری بن رہی ہے۔ آرٹس کونسل کی عمارت کے پاس ہے۔ اب تو مکمل ہونے والی ہے۔ اس زمانے میں ان سے ملاقات رہی۔ انہوں نے اپنی تصاویر آرٹس کونسل کو دی تھیں۔ انہوں نے بیڑا غرق کردیا۔ کچھ بچ گئی تھیں۔ بمبئی سے انہوں نے تھری آرٹ سرکل کے نام سے ایک حلقہ قائم کر رکھا تھا۔ تھری آرٹ کا مطلب تھا۔ ڈانس، میوزک اور مصوری۔ تو کبھی کبھی ہم بھی اس کی سرگرمیوں میں شامل ہوجاتے تھے۔ بڑا اچھا حلقہ تھا۔

کاشف زبیر: اپنی آرٹ کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

مرزا صاحب: 1943ء میں پونا میں آرٹ ایگزی بیشن تھی۔ پونا بمبئی سے ایک سو بیس میل کے فاصلے پر ہے اور ہل اسٹیشن ہے۔ میں اور میرے ایک ساتھی سیل بہاری لال بربریا نے فیصلہ کیا کہ ہم بھی اس ایگزی بیشن میں حصہ لیں گے۔ بربریا وکیل تھا اور ایل ایل بی کرکے پھر آرٹ اسکول میں آیا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں وہ سب سے آگے تھا۔ ورنہ ہم سے کم ہی میٹرک پاس تھے اور اکثر تو بالکل ہی گئے گزرے تھے۔ اس کے ساتھ شروع میں لڑائی رہی تھی۔ میں ایک بار اس کی میز سے ربر اٹھا لایا تو بولا حرام چیزیں بہت پسند ہیں۔ میں نے برجستہ کہا ہاں اسی لئے تو تمہیں اتنا پسند کرتا ہوں۔ اس روز کے بعد سے سب اسے ربر کہنے لگے تھے پھر میرے منہ نہیں لگا تھا جان گیا کہ اس سے الجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ جب ہم جارہے تھے تو دوسروں نے بھی اپنی تصویریں ساتھ کردیں اب کوئی پچاس کے قریب تصاویر جمع ہوگئی تھیں اور انہیں لے جانے کا مسئلہ پیدا ہوا کیوں کہ پونا ایگزی بیشن والوں نے تصاویر جمع کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ہاں واپسی پر ساری تصاویر پہنچانے کا کہا تھا کیوں کہ ایک ہی جگہ ہوتیں البتہ ان کا جمع کرنا مشکل کام تھا۔ میں اسٹیشن پہنچا تو ٹرین چلنے میں پندرہ ہی منٹ رہ گئے تھے اور بربریا پہنچا کوئی دو منٹ پہلے تو آدھی تصویریں تو ہم نے جلدی جلدی رکھ دیں اور آدھی ابھی پلیٹ فارم پر پڑی تھیں اور گارڈ نے وہسل دے دی۔ یہ ریس اسپیشل ٹرین تھی اس لئے وقت پر چلتی تھی اب بربریا نے شور مچایا۔ جمیل زنجیر کھینچ دیئے میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور زنجیر کھینچ دی، ٹرین رک گئی۔ یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ زنجیر کس ڈبے سے کھینچی گئی ہے۔ فوراً ہی اینگلو انڈین گارڈ آگیا اور شور کرنے لگا۔ کس نے روکی ہے کیوں روکی ہے۔ یہ ٹرین ہرگز نہیں رک سکتی تھی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے کہا اب ٹرین تو رک گئی ہے۔ تصویریں رکھ دی جائیں۔ بعد میں جو ہوگا۔ دیکھا جائے گا اس زمانے میں پچاس روپے جرمانہ ہوتا تھا جو بہت بڑی رقم تھی اور ظاہر ہے ہم بالکل ادا نہیں کرسکتے تھے وہاں پر کچھ مراٹھی اور گجراتی بیٹھے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ واقعی ہماری تصویریں باہر رہ گئی تھیں اور یہ کہ ہم طلبا بھی ہیں۔ جب گارڈ

نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے صحیح کیا یا غلط تو انہوں نے کہا بالکل صحیح کیا صاحب۔ اگر ٹرین چل جاتی تو ان لوگوں کا بڑا نقصان ہو جاتا۔ تو ان لوگوں نے ہمارے سر سے بوجھ اتار دیا۔ اور ہم پونا جا پہنچے۔ اگیزی بیشن کا وقت صبح تھا اب سوال یہ تھا کہ اس دوران میں وقت کہاں گزارا جائے۔ بربریا نے کہا دھرم شالے چلتے ہیں۔ میں نے کہا مروائے گا کیا۔ بولا ایسا کرو تم جے مل بن جاؤ اور میں تو ہوں ہی سیل بہاری لال بربریا (قہقہہ) یوں ہم دھرم شالے جا پہنچے وہاں میرا نام جے مل لکھا گیا اور ہم نے رات سکون سے گزاری۔ تصویریں سرہانے رکھی تھیں۔ صبح ہم نے تصویریں نمائش میں دیں اور خود پونا کی سیر کرنے کے لئے نکل گئے اور خاصی دور نکل گئے۔ بے موسم کی بارش نے آلیا اور اتنی بارش ہوئی کہ راستے بند ہو گئے اور جہاں گئے تھے۔ وہاں سے واپسی بھی ممکن نہیں رہی تھی۔ بربریا بڑا تیز تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر سے معلوم کیا ایک ہندو ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے پاس رات گزاری جا سکتی تھی۔ بہ شرط یہ کہ ان کو شیشے میں اتارا جا سکے یس جے مل بنا رہا کیوں کہ وہ چھوت چھات کے بھی قائل تھے۔ بربریا نے انہیں قائل کر لیا اور کچھ وہ ہماری شریف صورتوں سے متاثر ہوئے تھے۔ خود بھی شریف آدمی تھا اس لئے رات ہمیں اپنے گھر میں ٹھہرالیا۔ وہ، اس کی بیوی اور بیٹی ہماری خاطر مدارات کرتی رہی تھیں۔ بھابی کے ساتھ پوریاں بنا کر بھیجتی رہی اور ہم کھاتے رہے۔ نہ جانے کتنی کھا گئے بھوک بھی کھل کر لگ رہی تھی۔ شرمندگی بھی ہوئی کہ ان سے جھوٹ بولا۔ بہرحال صبح کا ناشتا کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

اس سے بھی ایک دلچسپ واقعہ سناؤں۔ ہم چار دوست تھے۔ ہم نے ٹرین سے بمبئی سے دلی جانے کا پروگرام بنایا۔ اس زمانے میں بمبئی سے دلی تک کا کرایہ تیرہ روپے تھا لیکن اسٹوڈنٹ پاس پر بہت رعایت ہو جاتی تھی اور اگر زیادہ طلبا ہوں تو پھر تو بہت ہی رعایت ہو جاتی تھی۔ میرے ساتھ حکیم بھوپلے تھے۔ وہ ہندو تھے۔ ایک مجید تھے فائنل ایئر میں تھے اور ایک مجھ سے جونیئر تھا عبدالستار۔ دلی میں تو سب ہمارے ہاں ٹھہرے۔ لیکن جب سیر کے لئے آگرے گئے تو رہائش کا مسئلہ ہو گیا۔ اتفاق سے کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ چار پانچ ہوٹلز دیکھنے کے بعد ایک پسند آیا۔ ہوٹل کا مالک ہندو تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ بل کیسے ادا کیا جائے۔ یہ جو عبدالستار تھا بڑا استاد تھا۔ اس نے کہا کہ اسے باتوں میں لگا کر اسے کہتے ہیں کہ تیرے ہوٹل کا نیا بورڈ بنا دیں اور ہم نے سچ مچ اسے پھنسا بھی لیا۔ ایسے لارے لپے دیئے کہ اسے مانتے ہی بنی۔ تو سب سے پہلے ہم نے کاسٹک سوڈا خرید کر اس کا بورڈ خراب کر دیا۔ یعنی جو بنا تھا اور اچھا خاصا بنا تھا۔ اسے صاف کر دیا۔ ہم نے اسے بتایا کہ یہ مجید صاحب کتنے بڑے آرٹسٹ ہیں اور جب یہ بورڈ بنائیں گے تو تمہارے بورڈ کی شان ہی کچھ اور ہو جائے گی۔ اب ہم نے کام شروع کیا۔ ہمارے پاس بہت ساری پرانی ٹیوبیں رکھی تھیں جن میں تھوڑا تھوڑا رنگ موجود تھا۔ ہم نے ان سے کام کیا اور یوں بنایا کہ ایک بیرا چائے کی پیالی پیش کر رہا ہے اور ساتھ ہی مالک سے کہتے بھی رہے کہ اس کا بورڈ اور بھی خوب صورت کر دیں گے۔ وہ جھانسے میں آ گیا اور ہر آئے گئے سے خوب تعریفیں کیا کرتا تھا۔ اب سات دن بعد اس نے ڈیڑھ سو روپے کا بل پیش کیا۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے ہمارا بل یہ دو سو روپے کا بنتا ہے۔ اس میں بھی ہم اپنی محنت نہیں لیتے۔ یہ ٹیوبیں لگی ہیں ان کا معاوضہ ہے۔ اب تو سٹ پٹا گیا حالت خراب ہونے لگی۔ بہت اُچھلا کودا مگر کیا کرتا۔ خیر جن سے ہماری تعریفیں کیا کرتا، انہیں ثالث بنایا گیا۔ اس نے انہیں بورڈ دکھایا کہ دیکھو انہوں نے یہ کیا ہے۔ مگر لوگوں نے بھی تعریف کر دی۔ اب انہیں کیا پتا کہ ہم کیا کرتے رہے تھے ہم نے ڈھیر ساری ٹیوبیں دکھائیں کہ یہ سب لگی ہیں۔ اتنا خرچ آیا ہے باہر سے آتی ہیں یہ ساری ٹیوبیں۔ اب وہ بہ ضد تھا کہ میرا بل ادا کیا جائے بے شک یہ بورڈ کو صاف کر دیں۔ میں رقم نہیں دوں گا۔ بہرحال ثالثوں نے فیصلہ کیا کہ تم کچھ دو اور نہ یہ کچھ دیں اور معاملہ ختم۔

کاشف زبیر: یعنی آپ کا مقصد پورا ہو گیا؟

مرزا صاحب: (قہقہہ) ہاں بھئی اور اس بورڈ کے اوپر ہم نے اپنا نام بھی لکھا تھا۔ روٹی گری: بمبئی میں ایک بہت بڑا ہوٹل تھا اس کا نام تھا رتنا گری اور اس کے وزن پر اس کا نام روٹی گری رکھ دیا۔ وہ بے چارہ سمجھتا رہا کہ یہ وہی نام ہے۔ ہم نے اسے کہا کہ دیکھنا کتنا مشہور ہوتا ہے یہ نام اور تمہارا ہوٹل۔ جب ہم رخصت ہوئے تو وہ رو رہا تھا کہ میری تو پورے مہینے کی آمدنی گئی۔ بہت سستا زمانہ تھا ایک روپے میں کئی وقت کا کھانا ہو جاتا تھا۔ بمبئی میں ایک آنے کی روٹی لو تو دال مفت مل جاتی تھی۔ یعنی ایک آنے میں آدمی آرام سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ اسکول آف آرٹ میں جو کینٹین تھی اس کا مالک گجراتی تھا۔ ہمارا اس سے حساب کتاب چلا کرتا تھا۔ ہم کھا پی لیا کرتے تھے اور وہ لکھ لیا کرتا تھا۔ تو اتنا سستا

پڑتا تھا کہ مہینے بھر میں بہ مشکل پانچ روپے بنا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں کئی بے حد امیر تھے مگر وہ بھی اسی کینٹین میں کھاتے تھے۔ ابراہیم عباس مغل دولت مند تھا لیکن ہم کوشش کرتے کہ اس کا خرچ نہ کروائیں گے۔ یہ بعد میں بولے۔ البتہ اس کے گھر جاتے تو خوب مدارات کرواتے تھے۔ وہ بھی ہمارے آنے سے خوش ہوتا تھا۔ اس کے گھر میں پرانے زمانے کے بے شمار نوادرات تھے خاص طور سے جنگی ہتھیاروں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ اس زمانے میں ایک خنجر رکھنے پر بھی اس کا لائسنس بنوانا پڑتا تھا جب کہ اس کے گھر میں درجنوں خنجر اور تلواریں تھیں۔ جب وہ ہمارے ہاں آتا تو ہم بھی اس کی مہمان نوازی کرتے تھے لیکن اس کا احسان لینا پسند نہیں کرتے تھے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ سیاست کا ہمارے ہاں عمل دخل صرف اتنا تھا کہ بعض سیاسی شخصیات ابا جان سے ملنے آتی تھیں۔ اور ان سے کام کرواتی تھیں۔ ان میں سروش کے مالک منشی وسیم الدین بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے اخبار کے کارٹوں بنا کردوں تو میں نے انہیں کچھ کارٹون بنا کر دیئے جوان میں خاصا مقبول ہوا تھا۔ اس میں بنگال کے مولوی عبدالحق کو بیک وقت دو کشتیوں میں سوار دکھایا گیا تھا کیوں کہ وہ بیک وقت مسلم لیگ میں بھی تھے اور اپنی مقامی پارٹی میں بھی۔ اس پر منشی صاحب نے کہا انہیں مزید کارٹون بنا کر دوں۔ تو میں نے جواب دیا کہ میں آپ کو کارٹون بنا کر دیتا رہوں گا تو اپنا کام کب کروں گا۔

1943ء میں مجھے ڈپلوما مل گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے سال کے لئے ورک شپ کی پیش کش ہوئی جس میں مجھے کام سیکھنے کے ساتھ نئے آنے والوں کو پڑھانا بھی تھا۔ اس میں مجھے ساٹھ روپے مہینے کا وظیفہ بھی مل رہا تھا۔ میں نے پیش کش قبول کرلی۔ اب میرے ذمے ایک کام یہ بھی تھا کہ ہر روز شام کو ایک کلاس لیا کروں۔ اس کلاس میں سارے طلبا انگریزی فوج سے ریٹائر ہونے والے فوجی افسران ہوتے تھے۔ کیوں کہ جنگ ختم ہورہی تھی اور لازمی طور پر فوجیوں کو فارغ کیا جاتا لہذا حکومت انہیں مختلف شعبوں میں تربیت دے رہی تھی تاکہ وہ روزگار حاصل کرسکیں۔ ان میں سے کچھ کامرس میں چلے گئے۔ کچھ تکنیکی شعبوں میں اور کچھ آرٹس کی طرف آگئے تو میرے حصے میں آئے تھے کوئی چالیس انگریز اور وہ مجھے بے بی ٹیچر کہا کرتے تھے۔ میں اس وقت بائیس برس کا تھا اگرچہ لمبا قد تھا لیکن چہرے سے کم عمری صاف جھلکتی تھی اور وہ تھے سب چالیس سال کے آس پاس تو وہ مجھے بے بی ٹیچر کہا کرتے تھے۔ میں ان کو سکھاتا تھا۔ ایک چیز جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی، وہ ان کے پسینے کی بُو تھی۔ جب وہ بٹالین کی طرح کوئیک مارچ کر کے کلاس میں داخل ہوتے تو سب ہی پسینے میں تر ہورہے ہوتے تھے، ان کے پسینے کی بُو سے سانس لینا محال ہوجاتا تھا۔ حکومت نے انہیں کوئی ٹرانسپورٹ نہیں دی تھی اور وہ پیدل دوڑتے ہوئے آتے تھے۔ بمبئی کے موسم میں بلا کی گرمی ہے۔ سردیوں میں بھی اگر آدمی دھوپ میں چلے تو اسے پسینہ آجاتا ہے۔ گرمیوں میں حشر نشر ہوجاتا تھا۔ پسینہ تھا کہ خشک ہی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ بو برداشت سے باہر ہوتی تھی...... نہ جانے کیسے میں نے دو سال تک اس کلاس کو سکھایا تھا۔

کاشف زبیر :- آرٹ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو پہلا موقع کون سا ملا تھا؟

مرزا صاحب :- 1943ء میں مجھے آل انڈیا آرٹ انڈسٹری کا سب سے بڑا انعام ملا تھا۔ اسی طرح آرٹ اسکول کی طرف سے بھی پہلا انعام ملا۔ اس پر خاصی شہرت ہوئی تھی اور اخباروں میں بھی نام آیا تھا۔ یہ شہرت بمبئی میں شروع ہونے والے نئے مسلم بینک حبیب بینک تک جا پہنچی۔ اس وقت اسے دو بھائی احمد علی حبیب اور محمد علی حبیب چلا رہے تھے بعد میں یہ خاندان دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ اس وقت یہ دونوں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا روضہ بنوا کر اسے نجف شریف بھجوا رہے تھے۔ خالص چاندی سے بنا یہ روضہ ہو بہو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقبرے کی نقل تھا۔ اس کی ڈرائنگ بنانے کا کام مجھے سونپا گیا تھا۔ یہ کام مجھے روضے کی تصویروں کی مدد سے کرنا تھا۔ یہ چار بائی چار کے سائز میں اور وزن میں کوئی دو من تھا۔ میں نے اسے کاغذ پر اسکیچ کیا۔ مختلف فوٹوؤں کی مدد سے جو مختلف فاصلوں سے کھینچے گئے تھے اور ان کی مدد سے ہو بہو ویسا ہی ڈیزائن کرنا بے حد دشوار کام تھا۔ ساتھ ہی سناروں کو سمجھانا بھی تھا کہ اسے کیسے بنانا ہے۔ خاص طور سے گنبد اور میناروں کو عین اسی تناسب سے بنانا واقعی دشوار کام تھا۔ مگر اسے میں نے بڑی توجہ اور بڑی تندہی سے مکمل کیا تھا۔ جب یہ مکمل ہوا تو سب بہت خوش ہوئے تھے۔ خاص طور سے احمد علی حبیب اور محمد علی حبیب۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے اپنے ایک ذیلی ادارے جس کے تحت یتیم خانہ چل رہا تھا اور جن لوگوں نے اس یتیم خانے

کے لئے رقم دی تھی، ان کی پورٹریٹ بنوانی ہیں۔ یہ پورٹریٹ یتیم خانے کے بڑے ہال میں لگائے جائیں گے۔ میں نے کہا کہ بالکل بنا دوں گا۔ طے ہوا کہ مجھے پچاس روپے فی تصویر معاوضہ دیا جائے۔ کل چالیس تصویریں تھیں جو میں نے دو مہینے میں تیار کر کے دے دیں۔ جو شاید آج تک وہیں لگی ہوں۔ مجھے دو ہزار روپے ملے تھے جو اس زمانے کے لحاظ سے معقول رقم تھی۔ اتنے کم وقت میں اتنی رقم کمانا تعجب خیز ہی تھا۔ یہ پیشہ ورانہ طور پر پہلا بڑا کام تھا جو میں نے کیا تھا۔

بمبئی میں کام کرنے کے دوران میں والد صاحب اور منظور بھائی اکثر دلی چلے جاتے تھے۔ اب ان کے جوگا بک تھے وہ آیا کرتے کہ وہ لوگ کب آئیں گے۔ میں انہیں بتاتا کہ والد صاحب اور بھائی دلی سے جلد آئیں گے لیکن وہ اپنا کام جلد کروانا چاہ رہے ہیں تو ایک صاحب دلی جارہے ہیں ان کے ہاتھ بھجوا دیتا ہوں۔ جب وہ آئیں گے تو لیتے آئیں گے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ ہمیں جلدی کام مل رہا ہے۔ اب ہوتا یہ تھا کام میں کر دیتا تھا اور جب وہ پوچھا کرتے تو بتاتا کہ کام اس روز آجائے گا اور اس روز میں انہیں کام دے دیتا تھا۔ اب وہ بالکل نہیں جان سکتے تھے کہ کام میں نے کیا ہے، ابا جان یا بھائی صاحب نے کیا ہے۔ اس کا خیال مجھے یوں آیا کہ ابا جان کہا کرتے تھے کہ تم ماڈرن آرٹ کرتے ہو اس لئے بھوکے مروگے۔ اگر کبھی کبھار کسی کو کوئی تصویر پسند آگئی تو ٹھیک ہے ورنہ فاقے کرو۔ اس کے بجائے کمرشل آرٹ کی طرف آؤ تمہارے کام کرنے کی رفتار بہت تیز ہے تو میں نے ان کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور آخر میں بہت سارا کام میں اکیلے ہی کرنے لگا تھا۔

اس کے بعد جب میں نے بمبئی کے ایک فلم اسٹوڈیو میں کام کیا۔ اس میں مجھے صرف پینتالیس روپے ملے تو میں نے کہا بھاگ لو یہاں سے۔ بعد میں سہنا صاحب نے مجھے کہا کہ میں ایران کی ایک رات نامی فلم بنا رہا ہوں۔ تم اس میں آرٹ ڈائریکٹر کے طور پر آجاؤ۔ میں نے کہا کہ مجھے کچھ آتا جاتا ہے نہیں۔ بس یہ سیکھا ہے اتنے دنوں میں۔ ان دنوں مجھے ہر کام کرنے کا شوق ہو رہا تھا۔ ہر جگہ گھس کر دیکھتا تھا۔ سہنا نے مجھے پانچ سو روپے تنخواہ دی تھی۔ ساتھ ہی میری رہائش اور تمام خرچے بھی وہی اٹھاتا تھا۔ اس سے کچھ ایسی دوستی ہوگئی کہ کلکتے میں ان کے گھر میں ہی ٹھہرا کرتا تھا۔ ان کا بڑا سا بنگلا تھا۔ اس میں ایک اچھا کمرا مجھے دیا تھا جس میں تمام سہولتیں موجود تھیں۔ وہ مجھ سے کوئی نو دس سال بڑے تھے لیکن بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے۔

سہنا صاحب سے تعلق کس طرح پیدا ہوا...... یہ بھی ایک کہانی ہے۔ ابا جان کے دوست تھے تراب صاحب' ان کا یہاں پر زیب النساء اسٹریٹ پر تراب اسٹوڈیو ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے بارہ سال بڑے تھے اور آرٹسٹ کے طور پر انہوں نے بہت نام پیدا کیا۔ وہ کمرشل آرٹ کے ماہر تھے اور اس زمانے میں فلم انڈسٹری کے لیے کام کرتے تھے۔ **1942**ء میں مجھے آل انڈیا آرٹ انڈسٹری کی جانب سے پہلا انعام ملا تھا۔ جس عمارت میں ہم رہتے تھے وہاں منشی نظر محمد بھی ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے وہ فلم کے بہت مانے ہوئے پرنٹر اور آرٹسٹ تھے۔ ان کا تعلق لاہور سے تھا۔ جس روز مجھے انعام ملا اور میں گھر کی طرف آیا تو وہ راستے میں سیڑھیوں پر کھڑے تراب صاحب سے بات کر رہے تھے۔ منشی صاحب نے پوچھا کہ اول انعام کسے ملا ہے' میں نے کہا مجھے ملا ہے۔ انہوں نے تراب صاحب سے کہا یہ جمیل ہے اور اس کا تعلق اسکول آف آرٹ سے ہے۔ اس پر انہوں نے کوئی تین بار مجھے اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا تھا۔ انہوں نے میری کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ اس مقابلے میں انہوں نے جو تصویریں بھجوائی تھیں، ان میں سے نمائش کے لیے ایک بھی سلیکٹ نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے کوئی بارہ سال بڑے اور بہت مانے ہوئے آرٹسٹ تھے۔ انہوں نے اس وقت اس بات کو محسوس کیا تھا لیکن بعد میں میرے ان سے بڑے اچھے تعلقات ہوگئے تھے۔ میں ان کے گھر آتا جاتا تھا اور ان کے پوسٹرز اور شوکارڈز میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس دور میں مجھے ہمہ وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی دھن سوار رہتی تھی۔ انہیں کام کرتے دیکھتا تو کہتا چلو یہ بھی کر کے دیکھ لوں۔ ان سے دوستی ہوئی تو انہوں نے مجھے فلم انڈسٹری سے روشناس کرایا۔ چوہدری نام کے ڈائریکٹر کو آرٹ ڈائریکٹر کی ضرورت تھی۔ تراب صاحب نے مجھے اس کے پاس بھیج دیا۔ میں نے اس کے لیے دو مہینے تک کام کیا۔ مجھے اسٹوڈیو وہاں کا ماحول اور کام دیکھنے کا موقع ملا۔ دن بھر چیزوں سے چمٹا رہتا تھا۔ ہر کام میں ہاتھ ڈالتا تھا۔ جو ملتا اسے کرنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ مجھے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ میں نے ان سے کہا صاحب میں برابر آرہا ہوں، دو مہینے سے صبح سے شام تک کام کرتا ہوں تو اب تک کوئی تنخواہ وغیرہ نہیں ملی۔ انہوں نے منشی کو طلب کیا۔ بھئی منشی انہیں

پینتالیس روپے دے دو۔ یوں دو مہینے کی محنت کا معاوضہ مجھے پینتالیس روپے ملا۔ میں نے کہا بھاگ چلو یہاں سے (قہقہہ)

اب اتفاق سے باسو پرشاد سنہا بھی تراب صاحب کے دوست تھے۔ انہیں اپنی ایک فلم ایران کی ایک رات کے لیے آرٹ ڈائریکٹر کی ضرورت تھی۔ یہ کلکتے میں ہوا کرتے تھے لیکن جب 1942ء میں جاپان نے کلکتے پر بمباری شروع کی تو یہ بمبئی چلے آئے تھے۔ ان کی دو بیویاں تھیں۔ ایک بیگم کو آرٹ سے شغف تھا۔ انہیں میں نے جے جے آرٹ اسکول میں داخل کروایا تھا۔ اسے خود بھی سمجھا تا تھا اور اس کے کام کی اصلاح بھی کیا کرتا تھا۔ جب انہوں نے مجھے منتخب کرلیا تو میں نے صاف کہہ دیا مجھے فلم آرٹ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم بس یہ دو مہینے تک سیکھا ہے۔ سنہا نے کہا کوئی بات نہیں اور یوں میں صرف چوبیس برس کی عمر میں آرٹ ڈائریکٹر بن گیا۔ حالانکہ یہ عہدہ بڑے بڑے تجربے کار قسم کے لوگوں کو ملا کرتا تھا۔ جس روز میں کلکتے پہنچا، جنگ ختم ہوچکی تھی۔ یہ اگست کی کوئی تاریخ تھی۔ امریکا نے جاپان پر ایٹم بم گرادیا تھا۔

کاشف زبیر :- آرٹ اور فلم آرٹ میں کیا فرق ہے؟

مرزا صاحب :- عام آرٹ کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں لہذا میں فلم آرٹ کے بارے میں بتاتا ہوں۔ فلم آرٹ کے کئی حصے ہوتے ہیں۔ ایک تو آرٹ ڈائریکٹر کا حصہ ہوتا ہے اور ایک یہ جو شوز کارڈز اور پوسٹرز وغیرہ بناتے ہیں۔ آرٹ ڈائریکٹر کے بھی دو تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک تو سیٹ ڈیزائننگ کا ہے کہ اب فلم میں ڈرائنگ روم چاہیے، محل چاہیے یا جھونپڑی۔ وہ اپنے تخیل کو آزماتا ہے اور سب کچھ طے کرتا ہے اس میں سامان سے لے کر روشنی اور کیمرا اینگل تک سب آجاتا ہے۔ اس طرح کپڑوں کی ڈیزائننگ ہے۔ اس زمانے میں فلم رنگین نہیں ہوا کرتی تھی لیکن یہ کہ کنٹراسٹ کس سے آئے گا۔ کپڑا کیا ہو اور ڈیزائن کس طرح کا ہو پھر اسے ٹیلرنگ ہاؤس سے سلوانا اور چیک کرنا کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ ایران کی ایک رات کیونکہ کاسٹیوم فلم تھی اس لیے اس میں آرٹ ڈائریکٹر کا کام کچھ زیادہ ہی تھا۔ آرٹ ڈائریکٹر کا کام یوں بھی مشکل ہے کہ ڈائریکٹر ہر شے اپنی مرضی کی چاہتا ہے چاہے وہ تکنیکی لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔

کاشف زبیر :- آپ نے پی سی بروا کے بارے میں کہا۔ ذرا ان کے بارے میں کچھ بتائیے۔ یہ وہی پی سی بروا ہیں جنہوں نے دیوداس جیسی تاریخی فلم بنائی۔ ان کی دیوداس میں کے ایل سہگل نے کام کیا تھا۔

مرزا صاحب :- یہ پرانی بات ہے 1933ء کی۔ میری بروا سے ملاقات 1945ء میں ہوئی تھی۔ جب سنہا نے لے جا کر مجھے اس کے حوالے کیا تھا۔ ان کی بد دماغی مشہور تھی خاص طور سے اپنے ماتحتوں کے حوالے سے۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ کہاں آ پھنسا (قہقہہ) بروا نے مجھے دیکھا اور حکم جاری کرنا شروع کردیا۔ یہ دیکھو۔ یہ کرو بھئی اور جب میں نے کرکے دکھا دیا تو اسے کچھ اطمینان ہوا تھا کہ یہ لڑکا کرسکتا ہے۔ وہ پرنس بروا کہلاتا تھا۔ اس کی آسام میں ریاست تھی گوری پور کے نام سے۔ بہت بڑی تو نہیں تھی لیکن ریاست کہلانے کی حق دار تھی۔

کاشف زبیر :- یعنی سچ مچ شہزادے تھے؟

مرزا صاحب :- ہاں، اور کیونکہ وہ ذرا مختلف آدمی تھا تو ریاست چھوڑ کر فلموں میں آ گیا۔ اس نے اداکاری بھی کی اور پروڈکشن بھی لیکن اس کا اصل میدان ڈائریکشن تھا۔ اس کی کئی فلمیں بے پناہ مشہور ہوئی تھیں جیسا کہ آپ نے دیوداس کا حوالہ دیا۔ اس نے شادی بھی ایک اداکارہ سے کی شاید اس کا نام جمنا تھا۔ اسے شراب کا بے پناہ شوق تھا اور اس چکر میں اس کے جگر، گردے اور پھیپھڑے سب خراب ہوگئے تھے۔ ایران کی ایک رات کی تکمیل کے دوران میں اس کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہوئی تو وہ علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ چلا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ اب مصیبت یہ آ پڑی کہ فلم مکمل کیسے کی جائے۔ اکثر شوٹنگ ہوچکی تھی اور یہ سب ٹکڑوں کی صورت میں تھی۔ اب اسے جوڑے کون۔ یہ کام وہی کرسکتا تھا اسے معلوم تھا کہ کون سا ٹکڑا کس کے ساتھ لگے گا۔ اس کی شوٹنگ کا طریقہ یہ تھا کہ جب موڈ ہوا شوٹنگ کرلی اور اسی دوران میں اسے ایک نمبر دے کر رکھ لیا۔ اسے ہی معلوم ہوتا تھا کہ فلم کس انداز میں بنے گی۔ دوسرے اس گورکھ دھندے سے گھبراتے تھے لیکن شوٹنگ مکمل ہونے کے بعد جب وہ آخر میں بیٹھتا تھا تو سب جوڑ جاڑ کر فلم بنالیتا تھا۔ ایران کی ایک رات میں اس کے جو نائب تھے، ان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی۔ بہرحال انہوں نے کوشش کی اور فلم کو مکمل کردیا۔ اگرچہ ویسی بات نہیں بنی پھر فلم لیٹ بھی بہت ہوگئی تھی۔ یہ 1952ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ یعنی سات سال بعد۔

بروا کی خاص بات تھی جس روز اسے چھٹی کرنا ہوتی تھی وہ سب سے پہلے سیٹ پر پہنچ جاتا تھا اور شور کرتا چلو کام کرو

لہٰذا سب حرکت میں آ جاتے لیکن عین موقع پر معلوم ہوتا کہ دوسری ہیروئن چندراوتی تو آئی ہی نہیں۔ وہ حکم دیتا۔ جاؤ بھئی مکرجی اسے بلا کر لاؤ۔ مکرجی اس کے گھر گئے اور تھوڑی دیر بعد منہ لٹکا کر واپس چلے آئے کہ اس کی تو آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب بروا پوچھتا۔ سنہا کیا کریں۔ اب بے چارہ سنہا کیا کرے کہتا تھا چھٹی کرو۔ سنہا نے مجھے آرٹ ڈائریکٹر کے ساتھ پروڈکشن کنٹرولر بھی بنا دیا تھا۔ اسے مجھ پر بھروسا تھا اور کہتا تھا یہ سب اڑنگے بازی کرتے ہیں۔ میں اسے کہتا یہ بھی تو اڑنگے بازی ہے۔ تھوڑی دیر میں سب وہیں پہنچ جائیں گے اور ایسا ہی ہوتا۔ اب بروا پکنک منانے کو کہتا اور سب چل پڑتے۔ پیک اپ کیا جاتا اور پکنک کا سامان پہلے سے ہی تیار ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں چندراوتی بھی آ جاتی۔ یوں چھٹی لی جاتی تھی۔

نعمان احمد: فلم اور ٹی وی کے آرٹ میں کیا فرق ہے؟

مرزا صاحب: کوئی فرق نہیں ہے۔ فلم جو ہے وہ چند مہینے سال ڈیڑھ سال میں بنتی ہے اور اس کا خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ٹی وی ڈرامے میں ایسی بات نہیں ہے۔ فلم کے دو تین سین کے خرچ میں ٹی وی ڈراما بن جاتا ہے۔ آرٹ کے لحاظ سے بھی خاص فرق نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ڈرامے میں آرٹ ڈائریکٹر کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی ہے زیادہ تر بنی بنائی چیزوں سے کام چلایا جاتا ہے۔

کاشف زبیر: کلکتے میں آرٹ کے لحاظ سے کوئی ایسی شخصیت جسے آپ آج بھی یاد کرتے ہوں؟

مرزا صاحب: سب سے پہلے تو پی سی بروا سے واسطہ پڑا تھا لیکن آرٹسٹ کے طور پر با وقار شخصیت والد صاحب کے ایک دوست جناب استاد محمد حسین مستری صاحب کی تھی۔ فلم اور تھیٹر سے ان کا تعلق زیادہ نہیں تھا لیکن بہت ہی تجربے کار، باصلاحیت اور محنتی آدمی تھے۔ سب سے بڑھ کر کام کرانے کے ہنر سے واقف تھے۔ ان کے ماتحت سو آدمی کر دیے جاتے تو وہ سب سے کام لے لیا کرتے تھے۔ آرٹ ایسا شعبہ ہے کہ دس بارہ ماتحت ہی عذاب بن جاتے ہیں۔ استاد اس چیز کے بھی ماہر تھے کہ کون سی چیز کس طرح بنائی جائے، اس معاملے میں ان کا دماغ بے حد تیز تھا۔ ایک سین میں بڑے بڑے باز دکھائے جاتے۔ ان کا بنانا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے ترکیب یہ کی کہ بڑے بڑے مٹکے خریدے اور ان پر پلاسٹر آف پیرس سے باز بنوائے۔ اس طرح فلم میں جو کام میرے بس کا نہیں تھا۔ وہ انہوں نے مجھے کر کے دیا۔ سیٹ ڈائریکشن صحیح معنوں میں میں نے ان ہی سے سیکھی تھی۔ انہوں نے میری مدد کی ورنہ میں پریشان ہو جاتا۔ ایک آدمی جس کا دماغ پینٹ برش والا ہو پانچ دس آدمیوں سے تو ڈانٹ ڈپٹ کر کام لے سکتا ہے لیکن سو آدمیوں سے کام لینا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس معاملے میں استاد محمد حسین کا تجربہ واقعی بہت زیادہ تھا۔ وہ بے باک آدمی تھے اور کام لینے میں کسی سے نہیں ڈرا کرتے تھے۔ وہ دور تھا جب کلکتے میں ہندو مسلم فسادزوروں پر تھے تو انہوں نے ایک بنگالی کو لات ماردی کہ یہ تو نے کیا کام کیا ہے اسے دوبارہ سے کر کے لا۔ تو سب ان سے محبت بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ ان کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ کرتہ پاجامہ اور اس کے اوپر واسکٹ پہنا کرتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی سنیما ہال کے ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔

1946ء میں جو فساد ہوا کلکتے میں، کہا جاتا ہے کہ برصغیر میں اس سے بڑا ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا۔ ہندو پہلے سے تیار تھے۔ انہوں نے تین دن تک مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ محلے کے محلے صاف کر دیے۔ ہندو مسلمانوں کو قتل کر کے باوڑا برج سے نیچے پھینکتے رہے تھے۔ کہتے ہیں کئی روز تک ہگلی کا پانی سرخ رہا تھا۔ اتنے لوگ مارے گئے تھے۔ یہ وزیر اعلیٰ سہروردی کا زمانہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو بلا کر ڈانٹا یہ کیا حرکت کی ہے تم نے اب مجھ پر دباؤ ہے کہ فوج کو بلاؤں۔ ان کا مطلب تھا کہ ہندوؤں کے خلاف جوابی کارروائی کیوں نہیں کی۔ کہنے لگے اب میں تمہیں تین دن دیتا ہوں اس دوران میں تم نے جو کرنا ہے کرلو پھر میں فوج بلالوں گا۔ تین دن مسلمانوں نے جوابی کارروائی کی اور اتنا خون بہا کہ اس کی مثال ہندوستان میں نہیں ملتی تھی۔ سوائے سن سینتالیس میں پنجاب میں قتل عام ہوا تھا مگر انگریز کے دور میں یہ سب سے المناک واقعہ تھا۔

استاد محمد حسین اس زمانے میں بھی باقاعدگی سے اسٹوڈیو جاتے تھے اور میں نے کبھی انہیں ڈر کر گھر میں بیٹھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بہت ہی نڈر آدمی تھے سنا ہے کہ پہلے وہ ہندو ہوا کرتے تھے بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا تعلق بہت ہی امیر گھرانے سے تھا۔ ان کے گھر والے انہیں تلاش کرتے تھے اور یہ ان سے چھپتے پھرا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اکثر راہ چلتے کوئی بڑی سی گاڑی ان کے پاس آ کر رک جاتی۔ ان سے بات ہوتی اور وہ بیزاری سے جانے کا اشارہ کرتے تھے۔ یہ تھی ان کی بے نیازی،

بے غرض اتنے تھے کہ سب سے ایک ہی انداز میں پیش آتے تھے چاہے وہ سنہا یا اسٹوڈیو کا مالک ہو یا معمولی ورکر۔ سب سے ایک ہی نوعیت کی محبت سے پیش آتے تھے۔ میں نے ان میں جو رکھ رکھاؤ اور وجاہت دیکھی تھی، وہ مجھے کسی اور آرٹسٹ میں نظر نہیں آئی۔

ایک بار پی سی بروا کا موڈ ہوا تو کہنے لگا چلو سب گوری پور ہو کر آئیں۔ اب اس نے کہہ دیا تھا تو منع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پروڈیوسر صاحب بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ کام کا کیا ہوگا۔ ہم سب گوری پور روانہ ہوئے۔ خاصی دور تھی کلکتے سے یہ ریاست لیکن علاقہ بہت خوب صورت تھا ہرا بھرا اور سرسبز۔ ہم کوئی آٹھ دس دن وہاں رہے۔ اچھا اس علاقے میں شیر بہت ملا کرتے تھے۔ ایک روز طے ہوا کہ شیر کے شکار پر جائیں گے اور ہاتھی پر بیٹھ کر جائیں گے۔

اب تک دیکھا تھا لوگ ہاتھی پر بیٹھتے ہیں کبھی خود بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب ہم نے شیخی بگھاری کہ اتنی چوڑی تو ہوتی ہے اس کی کمر ہودج میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب باقی سب کو ہودج میں بیٹھے تھے اور میں ہاتھی کی ننگی پیٹھ پر، ایک ہاتھ میں رسی تھی اور دوسرے ہاتھ میں بندوق۔ کچھ دیر تو میں دوسروں کا مذاق اڑاتا رہا مگر جب ہاتھی نے چلنا شروع کیا تو میری حالت بری۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ سامنے بیٹھا مہاوت ایک تلوار نما شے سے شاخیں کاٹتا تھا تو سامنے راستہ نظر آتا تھا۔ اب شاخیں بھی ٹکرا رہی تھیں۔ اوپر سے یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں سے شیر نہ نکل آئے۔ مہاوت بھی کہہ رہا تھا صاحب ہوشیار بیٹھیں ورنہ گر جائیں گے۔ گرنے سے بچنے کے لیے رسی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی ہاتھ زخمی ہوگیا۔ بندوق چھوڑ نہیں سکتے تھے ورنہ شیر کا مقابلہ کس سے کرتے۔ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ کبھی ایک طرف پاؤں کرتے تھے کبھی دوسری طرف اور دونوں پیر پھیلا کر بیٹھ جاتے تھے۔ جب شام کو واپس آئے تو حالت بُری ہو رہی تھی چلنا پھرنا محال ہوگیا تھا۔ شیر نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اچھی رہی (قہقہہ) لیکن ہاتھی پر بیٹھ کر شکار کرنے کا شوق پورا ہوگیا۔ بعد میں بروا نے ہرن کا شکار کر کے ہماری دعوت کر دی تھی مگر شیر نہیں ملا۔

کاشف زبیر: خوش قسمتی سے (قہقہہ)

مرزا صاحب:- ہاں۔ بروا کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو گونگا تھا۔ اسے شکار کا شوق تھا۔ اس کے محل میں پوری پوری الماریاں بندوقوں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ بلا کا نشانے باز تھا۔ راجا کی گدی بھی وہی سنبھالتا تھا۔ ہمارا گوری پور کا یہ آٹھ دس دن کا سفر یادگار رہا تھا۔

ایران کی ایک رات جس اسٹوڈیو میں بن رہی تھی، وہ اندر پوری اسٹوڈیو کہلاتا تھا۔ اس کا مالک اندر کمار مارواڑی تھا۔ اس میں دو خصوصیات تھیں ایک تو وہ کسی کو پہلی تاریخ کو تنخواہ نہیں دیتا تھا۔ اس کا منشی اعلان کرتا تھا کہ سیٹھ چار تاریخ کو آئے گا۔ لہٰذا تنخواہ بھی چار کو ملے گی پھر کہتا دو دن بعد آئے گا۔ اس طرح کرتے کرتے کوئی پندرہ تاریخ ہو جاتی تب کہیں تنخواہ ملا کرتی تھی۔ اس کے ایک دوست نے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو ان لوگوں کو پہلی تاریخ کو تنخواہ کیوں نہیں دے دیتے۔ اس نے کہا۔ میں ان لوگوں کو جان بوجھ کر تنگ نہیں کرتا ہوں۔ اب اتنا بتاؤ کہ پندرہ دن کا بیاج زیادہ ہوتا ہے یا ان لوگوں کی قیں قیں۔ ان لوگوں کا کیا ہے پندرہ دن گزار لیتا ہے۔ اپن کو پندرہ دن کا بیاج مل جاتا ہے۔ یہ تھی اس مارواڑی سیٹھ کی کاروباری ذہنیت۔ دوسری خاص بات تھی کہ بلا کا رنگین مزاج تھا۔ شام کو اپنی پیڑھی سے اٹھ کر اسٹوڈیو آ جاتا تھا اور منشی کو حکم دیتا تھا کہ سب مرد باہر جائیں صرف ویویاں رہیں گی اندر۔ سب مرد باہر اور اندر صرف اداکارائیں اور جو ایکسٹراز ہوتی تھیں وہی رہ جاتی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ محفل جماتا تھا۔

کاشف زبیر: یعنی آدمی شوقین مزاج تھا۔

مرزا صاحب:۔ ہاں اور اس نے اپنے آدمیوں کے عجیب عجیب نام رکھ چھوڑے تھے۔ ایڈیٹر کو کہتا تھا ماما درزی کو بلاؤ۔ اس طرح فلم کے دوسرے شعبوں کے افراد کے بڑے عجیب نام رکھ دیے تھے۔ ان ہی دنوں کا ایک دلچسپ قصہ ہے۔ آپ نے کے ایل سہگل کا نام سنا ہوگا۔ اس زمانے میں وہ اسٹوڈیو کے تنخواہ دار ملازم تھے بلکہ ڈائریکٹر سے لے کر معمولی ایکسٹراز تک اسٹوڈیو کے ملازم ہوتے تھے۔ وہ ملازموں کی طرح صرف صبح سے شام تک کام کرتے تھے۔ سہگل گانے ریکارڈ کرا رہے تھے۔ ابھی وہ تیار ہوئے ہی تھے کہ ایک آدمی وہاں آ گیا، کہنے لگا۔ میں تمہارے گاؤں سے آیا ہوں۔ وہ اسے بالکل نہیں جانتے تھے لیکن کیونکہ اس نے سہگل کے گاؤں کا نام لیا تھا۔ سہگل نے ڈائریکٹر سے کہا۔ وہاں پر پروڈیوسر بھی بیٹھا تھا۔ میں اسے گھر چھوڑ کر آتا ہوں کیونکہ اس بے چارے کو نہیں معلوم میں کہاں رہتا ہوں۔ کہا نہیں پہلے ریکارڈنگ کراؤ پھر جانا۔ اس نے کہا۔ دیکھو یہ میرا گاؤں والا ہے اتنی دور سے مجھ سے ملنے آیا ہے تھکا ہوا ہے اب میں اسے شام تک یہاں تو

نہیں بٹھا سکتا۔ میں اسے چھوڑ کر ابھی واپس آتا ہوں۔ ڈائریکٹر نے حکم دیا نہیں پہلے ریکارڈنگ اور پھر گاؤں والا۔ تو جناب ریکارڈنگ شروع ہوئی۔ اس زمانے میں یہ سب بے حد مہنگا پڑتا تھا۔ یعنی آلات بار بار ریکارڈ نہیں کر سکتے تھے ایک ہی بار ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ اب ہوتا یہ تھا کہ گانے میں کوئی خرابی نکل آتی تھی لہذا پھر سے شروع ہوجاتا تھا۔ دو بار، تین بار، دس بار...... کرتے کرتے شام ہوگئی اور چھٹی کا وقت ہوگیا مگر وہ ایک گانا ریکارڈ ہو کر نہ دیا۔ ضد سوار ہوگئی تھی دونوں کو۔ سہگل گانا صحیح سے گا کر نہ دیں اور ڈائریکٹر انہیں جانے نہ دے۔ شام کو تنگ آ کر ڈائریکٹر نے کہا آپ جائیں۔ وہ بولا میں نے پہلے ہی کہا تھا میرا گاؤں والا آیا ہے مجھے جانے دو۔ ڈائریکٹر نے کہا۔ تیرا گاؤں والا ہے تیرا بھائی تو نہیں ہے۔ سہگل بولا میں نے جب کہہ دیا کہ میرا گاؤں والا ہے اب آپ ضد کر رہے ہیں تو کیجیے۔ دن بھر خراب ہوا گانا ایک ریکارڈ نہیں ہوا۔ ایسے ایسے سرپھرے لوگ تھے اس زمانے میں۔

نعمان احمد: کسی کو خاطر میں نہ لانے والے......

مرزا صاحب: ہاں۔ آرٹسٹ خاص طور سے بڑی ناک والے ہوتے تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں اتنے مضبوط نہیں ہوا کرتے تھے جیسا کہ آج کل ہیں۔ تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے لیکن جب کسی بات پر اڑ جاتے تھے تو کوئی خوف کوئی لالچ انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا تھا۔ انہیں اپنے فن پر اعتماد تھا کہ کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ لہذا ریکارڈنگ پیک اپ کر دی گئی۔ ویسے بھی شام ہو رہی تھی اور سہگل کے پینے کا وقت ہوگیا تھا بلکہ وہ شراب کا اتنا رسیا تھا کہ دن بھر چسکی لگاتا رہتا تھا۔

ہاں تو .... فسادات کی بات ہو رہی ہے۔ 1947ء میں گھر والے بہن کی شادی کے سلسلے میں بمبئی سے دلی گئے ہوئے تھے۔ میں کلکتے سے آیا تھا۔ تقسیم طے ہوچکی تھی اور وہاں خاصی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ جولائی کا مہینہ تھا جب گھر والے وہاں گئے اور اگست میں، میں پہنچا۔ ہمارا گھر کوچہ سعداللہ خان میں تھا۔ ہم اپنے آبائی گھر حویلی اعظم خان میں نہیں ٹھہرے تھے کیونکہ وہ خطرے کے علاقے میں تھی۔ کوچہ سعداللہ خان میں بھی ملی جلی آبادی تھی اگر ایک لائن مسلمانوں کی تھی تو دوسری لائن ہندوؤں کی۔ فسادات کی وجہ سے اردگرد کے سارے ہی رشتے دار ہمارے گھر آ گئے تھے۔ ہمارا گھر تین منزلہ تھا۔ برابر میں ایک ہندو خاندان تھا۔ اس کا مکان ایک منزلہ تھا یعنی صرف گراؤنڈ فلور پر مشتمل تھا۔ اب وہ روز شام کو سر پر پگڑی باندھ کر اور لٹھ لے کر ہمیں للکارا کرتے تھے۔ فسادات کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور روز لکڑی میں آگ لگا کر ہمارے گھر پر پھینکی جاتی تھی۔ ساتھ ہی وہ ڈرا بھی کرتے تھے کہ ہم اوپر تھے اور جوابی کارروائی زیادہ آسانی سے کر سکتے تھے۔ ویسے یہ سب شام ہی میں ہوتا تھا۔ دن میں وہاں امن و امان قائم رہا کرتا تھا۔ کشیدہ حالات کی وجہ سے ہم سب ہی جاگ رہے تھے۔ مسلسل تین چار دن جاگتے رہے تو سب کی حالت خراب ہونے لگی۔ میں نے والدہ سے کہا دیکھو اگر مسلسل سب جاگتے رہے تو حالات خراب ہوجائیں گے۔ اگر خدانخواستہ حملہ ہوا تو ہم میں کھڑے ہونے کا دم بھی نہیں ہوگا۔ دفاع کیسے کریں گے تو ایسا کرتے ہیں باری باری سب سوئیں اور کچھ پہرے پر جاگتے رہیں۔ بڑا کڑا وقت تھا۔ پہرے داری کی وجہ سے دن بھر میں بمشکل دو تین گھنٹے سو پاتے تھے لیکن کچھ نہ ہونے سے یہ بہتر ہی تھا۔ اس خستہ حالی کے باوجود ہمیں خود پر بھروسا اور اعتماد تھا کہ ہم مار نہیں کھائیں گے کیونکہ تعلیم ہمیں یہ دی گئی تھی کہ پٹ کر گھر نہ آنا۔ یہ میں مسلمان گھرانوں کی بات کر رہا ہوں۔ بمبئی اور کلکتہ میں بھی میں نے دیکھا تھا کہ مسلمان تھوڑے ہوتے تھے لیکن کبھی ڈرے نہیں، پیچھے نہیں ہٹے۔ پٹا نہیں کرتے تھے بلکہ پیٹ کر آتے تھے۔ بے حد بہادر اور نڈر، ہاں ایک آدھ کہیں پھنس جاتا تھا تو الگ بات ہوتی تھی۔ اکثر مسلمان اچھے لڑاکے ہوتے تھے خاص طور سے رام پوری جو چاقو چلانے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ میں نے اپنے ماموں سے لٹھ بازی سیکھی تھی۔ یہ چیز مجھے اب تک آتی ہے وہ تو خیر بڑے ماہر تھے ہم بچوں کو پکڑ پکڑ کر سکھایا کرتے تھے کہ کبھی کام آئے گا اور واقعی ان دنوں ہمیں لڑنا پڑتا تو یہ چیز ہمارے کام آ سکتی تھی۔

شروع اگست میں مجھے واپس کلکتہ جانا پڑا تھا کیونکہ کام کا دباؤ زیادہ تھا۔ گھر والے دلی میں ہی تھے۔ دس اگست نہیں، پانچ اگست کو ہمارے خاندان کو حویلی چھوڑ کر پرانے قلعے میں منتقل ہونا پڑا تھا جہاں مسلمانوں کے لیے پناہ گزین کیمپ بنایا گیا تھا۔ حویلی سے نکلنا دشوار ہوگیا تھا کیونکہ یہ علاقہ چاروں طرف سے ہندوؤں کے گھیرے میں تھا۔ نہ جا سکتے تھے نہ نکل سکتے تھے۔ خوراک ختم ہوتی جا رہی تھی۔ سرکار نے زبردستی یہ سارے علاقے خالی کرائے اور مسلمانوں کو پرانے قلعے میں بھیج دیا۔ جہاں مقبرہ ہمایوں اور بارہ دری میں لوگ ٹھہرے ہوتے تھے۔ پہلے چند لوگ تھے

پھر سیکڑوں ہوئے اور اس کے بعد ہزاروں افراد وہاں آ گئے تھے۔ تنگ جگہ میں سب گھس گھسا کر رہ رہے تھے۔ خوراک وہاں بھی نہیں تھی۔ رضا کار دال دے جاتے تھے۔ جسے اہال لیا جاتا تھا۔ کبھی کچی ہی کھانی پڑتی تھی اور اسی طرح کچی پکی روٹیاں ملتی تھیں۔ بڑا برا دور تھا اپنے پرائے بن گئے تھے۔ اس دور میں ایک فرشتہ صفت آدمی میرے گھر والوں کے کام آئے، یہ میرے بڑے بھائی کے دوست تھے۔ وہ ائر پورٹ والوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں ایک ائر لائن کے طیارے روزانہ ہندوؤں اور سکھوں کو لینے راولپنڈی کے ائر پورٹ چک لالہ جایا کرتے تھے۔ دو پروازیں روز ہوا کرتی تھیں۔ ان صاحب نے کمپنی والوں کو یہ سمجھایا کہ طیارے خالی کیوں لے جاتے ہو یہاں سے مسلمانوں کو لے جایا کرو اور ان سے بھی ٹکٹ کے پیسے لے لینا یوں ائر لائن والے دلی سے مسلمانوں کو بھی لے جانے لگے۔ یہ صاحب ہر روز جان پر کھیل کر ائر لائن کے دفتر جاتے تھے اور کچھ مسلمانوں کے لیے ٹکٹ کا بندوبست کر آتے تھے۔ انہوں نے ہی میرے گھر والوں کے لیے ٹکٹ کیے اور انہیں پاکستان روانہ کر دیا تھا۔ یوں گھر والے پہلے راولپنڈی پہنچے پھر وہاں سے لاہور چلے آئے جہاں کچھ دن ایک رشتے دار کے گھر رک کر کراچی کا رخ کیا تھا۔

دلی میں پرانے قلعے میں بڑے عبرت ناک مناظر دیکھنے میں آئے تھے۔ وہ دور بڑا پر آشوب دور تھا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی اور بعض لوگ تو ایسی حرکتیں کر گئے تھے کہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ جن کے پاس کھانے پینے کو تھا، وہ بے فکری سے گزر کر رہے تھے۔ دن رات ہنگامے ہوتے تھے، کیمپ میں گانے چل رہے ہوتے تھے۔ ایک صاحب اپنے پورے خاندان کے ساتھ پرانے قلعے میں آئے۔ ان کی ایک جوان سالی بھی تھی جب پاکستان آنے کا وقت آیا تو یہ اپنے بیوی بچوں کو وہیں چھوڑ کر صرف سالی کو لے کر چلے گئے نہ جانے ان کے بیوی بچوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اسی طرح ایسے بے غرض بھی تھے جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر دوسروں کی مدد کی تھی۔ بڑا عجیب سا وقت تھا۔ ایک طرف لوگ ہنس کھیل رہے تھے، دوسری طرف رو رہے تھے کہیں گانے چل رہے تھے اور کہیں زخمی چیخ و پکار کر رہے تھے۔ احساس نام کی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہی تھی۔

کاشف زبیر: یعنی کوئی اجتماعی سوچ نہیں تھی۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی؟

مرزا صاحب: ہاں بالکل کوئی اجتماعی سوچ نہیں تھی کچھ لوگ عیش کر رہے تھے اور اکثر کے پاس کھانے کو روٹی نہیں تھی۔ رضا کار کچھ لا کر دیتے تھے تو کھا لیتے تھے ورنہ بھوکے رہتے تھے۔ راشن بھی جیل والا ہوتا تھا۔ کنکر ملی دال اور چاول۔ غرض کہ بڑا برا وقت تھا۔

1949ء میں، میں کراچی آیا۔ یہاں میری شادی ہوئی اور میں واپس کلکتہ چلا گیا تو وہاں پر پھر فسادات ہو رہے تھے۔ میں ٹکٹ کے لیے ائر لائن کے دفتر گیا تو وہاں پر مسلمانوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ہر ایک جہاز میں ٹکٹ چاہتا تھا۔ سب اپنے سامان کے ساتھ ڈرے سہمے بیٹھے تھے کہ کہیں ہندو حملہ نہ کر دیں۔ اس زمانے میں ہندوستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ویزے کی پابندی نہیں تھی۔ ہاں مغربی پاکستان آنے جانے کے لیے ویزا چاہیے ہوتا تھا۔ میں کچھ عرصے وہاں مقیم رہا کہ حالات ٹھیک ہو جائیں لیکن ایسا نہیں ہو سکا تو میں نے کہا اب چلو یہاں سے۔ سب کچھ وہیں چھوڑ کر پاکستان چلا آیا تھا۔ گھر والے پریشان تھے۔ مجھے ان کی فکر بھی لگی رہتی تھی۔

کاشف زبیر: مووی آرٹ کے بارے میں کچھ بتائیے؟

مرزا صاحب: پہلے تو میں وضاحت کر دوں کہ جس وقت میں نے اس ادارے کا نام مووی آرٹ رکھا تھا۔ اس زمانے میں آرٹ کا لفظ کوئی نہیں استعمال کرتا تھا۔ یہ اعزاز بھی مجھے حاصل ہوا کہ میں نے سب سے پہلے لفظ آرٹ کو ایک ادارے میں استعمال کیا۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب پی سی بروا بیمار ہو کر سوئٹزرلینڈ چلے گئے تو فلم اسٹوڈیوز میں کام بند ہو گیا اور وہاں کام کرنے والے بے روزگار ہو گئے۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے پہلے ہی فلموں کے لیے پوسٹرز اور شو کارڈز بنانے کا کام مل گیا تھا۔ یہ کام بھی مجھے سنہا صاحب نے دلایا تھا۔ دو تین مہینے میں نے گھر پر کام کیا۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ لوگ گھر پر ہی کام لے کر آنے لگے تھے اور بہت سارے آرڈر ملے تھے۔ لہٰذا سوچا گیا کہ یہ کام ایک باقاعدہ ادارے کے تحت کیا جائے تو سنہا اور میں نے پارٹنرشپ میں مووی آرٹ کے نام سے آرٹ اسٹوڈیو قائم کر لیا۔ اس کے لیے پانچ کمروں کا ایک فلیٹ کرائے پر لیا گیا۔ فلیٹ ایک نئی عمارت میں تھا۔ جو حاکم بخش ملاح نامی مسلمان کی ملکیت تھی۔ یہ عمارت کلکتہ کی بیڈن اسٹریٹ پر تھی۔ یہ علاقہ ان دنوں نیا نیا آباد ہوا تھا۔ اسی وجہ سے علاقہ اور عمارت بے حد صاف ستھری تھی اور شاید اسی وجہ سے کرایہ بھی بہت زیادہ تھا، پانچ سو روپے

ماہانہ، اسے آج کے پچاس ہزار کے برابر سمجھیے، میں نے وہاں کام کا آغاز کیا اور شروع سے ہی چند آرٹسٹ اور فوٹو گرافر رکھے تھے۔ اصل کام تو میں ہی کیا کرتا تھا اور دوسروں سے عام نوعیت کے کام لیا کرتا تھا۔ جیسے لیٹرنگ کرون، بیک گراؤنڈ میں کام کراتا اور فوٹو گرافی وغیرہ......

فوٹو گرافی کے لیے ایک ڈارک روم بنوایا۔ فوٹو گرافر بھی رکھے تھے لیکن ان کو میں خود سپروائز کرتا تھا۔

کاشف زبیر: آپ کس دور کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسٹوڈیو اپنے عروج پر تھا۔

مرزا صاحب:- سن سینتالیس میں، میں نے اسے قائم کیا تھا اور سن انچاس میں جب میں یہاں آیا تو یہ اس کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی برس میں نے شادی کی تھی اور پھر اسٹوڈیو کو وائنڈ اپ کرنے چلا گیا تھا۔ اس وقت کوئی پچیس کے قریب آدمی وہاں کام کرتے تھے۔ یہ خاصا بڑا املہ تھا۔ ان میں آرٹسٹ تھے۔ فوٹو گرافر تھے۔ سیلز مین تھے جو جا کر کام لاتے تھے۔ ہم اس کی پبلسٹی بھی کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں پریس کا بھی کام کیا تھا۔ خاص طور سے میں نے گاندھی جی اور وزیراعظم نہرو کے پوسٹرز بنا کر دیے تھے۔ ایک انقلابی رہنما سبھاش چندر بوس کی تصویر بنائی تھی جو بے حد مشہور ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویر بھی ہمارے ہاں بنی تھی۔ یہ سب کام ہم نے اتنے اچھے طریقے سے کیے تھے کہ مثال بن گئی تھی۔ غرض کہ یہ آرٹ اسٹوڈیو ہر لحاظ سے بے حد کامیاب رہا تھا۔

نعمان احمد: اور جب آپ نے وائنڈ اپ کا فیصلہ کیا۔ اتنی کامیابی کے بعد، تو ان لوگوں کے کیا تاثرات تھے؟

مرزا صاحب: دراصل جاتے وقت میری اسے بند کرنے کی نیت بھی نہیں تھی بلکہ میں بیگم کو ساتھ لے جانے کا سوچ رہا تھا مگر وہاں جا کر میں نے جو حالات دیکھے خاص طور سے ہندو مسلم فساد...... اس نے میری سوچ کو بدل دیا اور میں واپسی پر غور کرنے لگا تھا۔ اچھا آرٹ اسٹوڈیو میں میرے پارٹنر تو سنہا صاحب تھے لیکن عملی طور پر پارٹنر ان کی بیگم ساوتری تھیں۔ وہ بزنس مینجمنٹ دیکھا کرتی تھیں اور آرٹ کا شعبہ میں نے سنبھالا تھا۔ یعنی پروڈکشن میرے ذمے تھی اور بزنس وہ دیکھا کرتی تھیں۔ جب میں نے کراچی میں شادی کی تو والد صاحب نے کہا کہ اب تم وہاں کیا کرو گے۔ ہم سب تو یہاں ہیں، بہتر ہے تم بھی واپس آجاؤ۔ ابا جان کی یہ ہدایت بھی میرے ذہن میں تھی۔ لہٰذا کلکتہ میں، میں نے اس پر سوچنا شروع کر دیا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ کراچی میں کوئی کام تو تھا نہیں۔ میں ہی کلکتہ سے پیسے بھجوا رہا تھا۔ اگر میں بھی کراچی چلا جاتا تو کام چلنا تو ذرا مشکل ہو جاتا۔ اس لیے میری کوشش تھی کہ اس سے جتنے بھی نقد پیسے مل سکتے ہیں، لے لوں اور پاکستان آجاؤں۔

اس زمانے میں جگ جیون رام جو بھارت کی مرکزی حکومت میں وزیر تھے۔ انہوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ بھارت میں کوئلے کی کان کنی کرنے والے جتنے بھی افراد تھے ان سب کے شناختی کارڈ بنائے جائیں۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح ان کے کام کی نوعیت میں باقاعدگی پیدا ہو جائے اور ان کے لیے کچھ سہولت پیدا ہو جائے گی۔ یہ بہت بڑا منصوبہ تھا۔ اتفاق سے جگ جیون رام، سنہا صاحب کے دوستوں میں سے تو ان کی وجہ سے امید تھی کہ اس کا ٹھیکا ہمیں مل جائے گا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ کام مل جاتا ہے تو اس میں بڑی اچھی کمائی ہو سکے گی اس صورت میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اس میں رقم بچ بھی جاتی۔ ورنہ روزمرہ کے کاموں میں تو یہ تھا ادھر رقم آئی ادھر رقم خرچ ہوگئی۔ دراصل جب ہم نے یہ کام شروع کیا تو صرف پانچ ہزار روپے کا سرمایہ تھا۔ اب اس رقم میں فلیٹ بھی لیا اور کچھ ضروری آلات بھی خریدے۔ اس کے باوجود آلات کی خاصی کمی تھی۔ تو ہم جتنا کماتے تھے، اپنا خرچ نکال کر سارا سامان اور آلات کی خرید پر لگا دیتے تھے۔ ہمارے پاس دو درجن ملازم تھے ان کی تنخواہیں پھر سامان کا خرچ اور آخر میں اپنا خرچ نکال کر زیادہ نہیں بچتا تھا۔ شروع میں میرے پاس اسپرے ورک کے لیے اسپرے گن نہیں تھی۔ یہ میں نے بعد میں خریدی۔ اسی طرح کیمرے اور فلم ڈیولپ کرنے کا سامان لیا تھا۔

میرے لیے سب سے زیادہ دل برداشتہ کرنے والی بات یہ تھی کہ آزادی کو دو برس ہونے کو آئے تھے لیکن اب تک فسادات کا سلسلہ نہیں رکا تھا۔ جس علاقے میں ہمارا دفتر اور میرا گھر تھا وہاں زیادہ مسلمان آباد تھے۔ اس لیے کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی کو چھرا گھونپ دیا ہو یا کسی مکان کو آگ لگا دی ہو لیکن شہر کے دوسرے علاقوں میں ایسے واقعات اکثر ہوا کرتے تھے تو میں نے سوچا کہ تھوڑے کی لالچ میں کتے کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ چلا جائے۔ اوپر سے گھر والوں کے مسلسل تقاضے تھے کہ تم آ کیوں نہیں جاتے۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا اور ایک دن سنہا صاحب سے کہا جو کچھ ہے وہ آپ کا۔ میں جا رہا ہوں۔

میں نے کچھ کپڑے لیے اور کچھ اپنا چھوٹا موٹا سامان لیا۔ جو ایک سوٹ کیس میں آ سکتا تھا اور اسے لے کر ڈھاکا چلا آیا۔ اس زمانے میں انڈیا اور مشرقی پاکستان کے درمیان سفر کے لیے ویزے کی شرط نہیں تھی۔ یہ شرط صرف مغربی پاکستان کے لیے تھی۔

ڈھاکا میں میرے ایک کلکتے کے زمانے کے دوست تھے خواجہ محمد قیصر، وہ خواجہ رحیم الدین کے بھتیجے تھے۔ میں کوئی دو مہینے تک ان کے گھر ٹھہرا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا میں ڈھاکے میں ہی ٹھہر جاؤں۔ مجھے وہاں پر کام دلانے کو کہا مگر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ ڈھاکا میں بھی دو مہینے رکنے کی وجہ یہ تھی کہ میں کلکتہ کے کول کنٹریکٹ کے منظور ہونے کا انتظار کر رہا تھا مگر اس میں بھی دیر ہو رہی تھی۔

کاشف زبیر: یعنی خالی ہاتھ چلے آئے۔

مرزا صاحب :- (قہقہہ) بہ قول شخصے تن کے کپڑوں میں۔ جب میں ڈھاکا سے چلا تو قیصر محمد نے مجھے خواجہ شہاب الدین کے نام خط دیا جو اس کے رشتے دار تھے اور اس زمانے میں ریفیوجی کمشنر تھے۔ ان کے ساتھ اشتیاق حسین قریشی ہوا کرتے تھے جو بعد میں کراچی یونیورسٹی کے وی سی بنے اور وفاقی وزیر بھی۔ ایک مزے کی بات بتاؤں کہ ان کے استاد تھے ڈاکٹر ذاکر علی اور جب اشتیاق حسین قریشی وزیر بنے تو یہ ان کے پی اے مقرر ہوئے تھے۔ زمانے کے الٹ پھیر تھے۔ ڈاکٹر ذاکر علی بہت قابل آدمی تھے۔

کاشف زبیر : اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے شاگرد ان کے بھی باس تھے یعنی جنرل محمد ضیاالحق۔

مرزا صاحب : جی اس سے دیکھیے۔ یہ ڈاکٹر ذاکر علی میرے تایا زاد بھائی اخلاق احمد کے گہرے دوستوں میں سے تھے ان کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ یہ سب اس زمانے میں خواجہ شہاب الدین کے پاس ہوا کرتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا مگر ان سے کوئی مدد نہیں ملی۔ میں نے کہا خود ہی کچھ کرو۔ میں نے فری لانس کام شروع کر دیا تھا۔ اس وقت کراچی میں کچھ ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں تھیں۔ مجھے کوئی اور کام تو آتا نہیں تھا کہ میں کما کر گھر والوں کو دیتا۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا میں یہ کام کر رہا ہوں۔ انہوں نے بڑی آؤ بھگت کی اور خاصا کام دے دیا۔ میں نے ان کے لئے کوئی دو مہینے تک کام کیا تھا۔ ڈیزائن بنائے جن سے انہوں نے تو خوب کمایا لیکن مجھے اتنے بھی نہیں دیئے کہ میرا آنے جانے کا خرچا ہی پورا ہو جاتا۔ وقت جو صرف ہوا تو اس کا کچھ صلہ نہیں ملا تھا۔

نعمان احمد : آپ کلکتہ میں ایک چلتا ہوا کام چھوڑ کر آئے تھے۔ کیا آپ نے بعد میں اس کی خیر خبر رکھی؟

مرزا صاحب :- موڈی آرٹ سے میرا رابطہ رہا تھا۔ وہ شروع میں بہت پریشان تھے کیوں کہ اصل کام تو میں کرتا تھا اور میرا متبادل لانے میں انہیں خاصی مشکل رہی تھی۔ مگر بعد میں وہ اس پر حاوی ہوگئے تھے۔ ان کے پاس بیس پچیس افراد تو تھے۔ اور بزنس ساوتری سنہا دیکھتی تھیں اور وہ بڑی اچھی منتظم تھیں۔ میری کمی دور کرنے کے لئے انہوں نے یہ ترکیب کی کہ اسٹوڈیو کا فوٹوگرافی کا شعبہ زیادہ ڈیولپ کرلیا تھا۔ موڈی آرٹس اب تک قائم ہے اس سے ادارے کی ساکھ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اب سنہا صاحب کا ذکر آیا ہے تو میں بتادوں کہ میری شخصیت پر ان کا بہت اثر ہے۔ کاروباری اصول میں نے ان سے ہی سیکھے۔ وہ بڑے اچھے کاروباری تھے اگرچہ قسمت اکثر ان کے ساتھ دھوکا کر جاتی تھی۔ ایک بار انہوں نے فلم بنانے کا لائسنس لیا۔ اس زمانے میں جنگِ عظیم کی وجہ سے ہر شے کی راشن بندی کر دی گئی تھی اور فلم لائسنس بھی دو لاکھ میں ملا کرتا تھا۔ اسے آج کے دو کروڑ روپے کے برابر سمجھیے۔ انہوں نے اتنی بڑی رقم کے عوض لائسنس لیا اور جب فلم بنانے کا مرحلہ آیا تو لائسنس ختم کر دیا گیا۔ یعنی فلم کا خام مال سستا ہوگیا اور اس پر راشن بندی کی حد بھی نہیں رہی۔ یہ ان کے لئے بہت بڑا دھچکا تھا۔ جسے انہوں نے کسی نہ کسی طرح برداشت کرلیا تھا۔ جب فلم مکمل ہونے والی تھی تو اس کے ڈائریکٹر پی سی بروا بیمار پڑ گئے اور بعد میں ان کا سوئٹزرلینڈ میں انتقال ہوگیا تھا۔ سارا کام رک گیا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فلم کے ان نامکمل ٹکڑوں کو کیوں کر جوڑا جائے۔ کسی نہ کسی طرح یہ کام بھی ہوا اور فلم سات سال میں جا کر ریلیز ہوئی۔ زیادہ اچھی بھی نہیں بنی تھی اس لئے فلاپ ہوگئی۔ پی سی بروا کے کئی نائب تھے۔ ایک راول گھوش تھے۔ ایک سونی تھے ایک سید احمد تھے جو مسلمان تھے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے درست کریں۔ فلموں کے ٹکڑے رش پرنٹ کہلاتے ہیں اور ان کو جوڑ کر پھر مکمل فلم بنائی جاتی ہے جو حقیقی پرنٹ پر آتی ہے۔ بڑی مصیبت پڑ گئی تھی سنہا صاحب کو۔ جب تک میں آیا تھا یہ فلم ریلیز نہیں ہوئی تھی۔ ہاں اسے سنسر کا سرٹیفکیٹ مل گیا تھا اور مکمل ہوگئی تھی۔

سنہا صاحب کی بدقسمتی کا ایک اور واقعہ بھی میرے سامنے کی بات ہے۔ بمبئی آ کر انہوں نے ایک فلیٹ لیا تھا۔ ایک روز وہ سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ لائٹ چلی گئی۔ ایک دم اندھیرا ہوا تو پاؤں غلط پڑ گیا۔ وہ نیچے گرے اور کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ خیر یہ اتنی خاص بات نہیں تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ آپریشن ہوجائے گا تو یہ جڑ جائے گی۔ اب ہوا یہ آپریشن کی تمام تیاریاں کرلی گئی تھیں اور ان کی کاٹا پیٹی بھی ہوگئی تھی پھر لائٹ چلی گئی۔ ان کے پاس ایک چھوٹا جنریٹر تھا۔ اسے چلا کر انہوں نے اسے سی دیا۔ اب کچھ عرصے بعد پھر آپریشن کا چکر ہوا تو لائٹ تو نہیں گئی۔ لیکن سرجن کا اسسٹنٹ تھا اس نے غلط نمبر کا ساکٹ دے دیا۔ پندرہ کے بجائے چودہ نمبر کا۔ تو ہڈی صحیح سے نہیں جڑی تھی۔ تو یہ ان کی بڑی بدقسمتی رہی تھی۔ فطرت کے لحاظ سے وہ بڑے اچھے آدمی تھے۔ تعصب ان میں بالکل نہیں تھا بلکہ وہ میرے ساتھ رمضان کے روزے رکھا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایک مہینے کے روزے رکھنے سے سال بھر میری صحت اچھی رہتی ہے۔ باقاعدگی سے ورزش کرتے تھے اور خود کو فٹ رکھا کرتے تھے۔ اپنے وزن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات تھی کہ جن دنوں ان کے پاس پیسے وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ یعنی فلم بنانے کے لئے فنانس مل جاتا تھا تو وہ اپنے آپ کو بالا پتلا کرلیتے تھے۔ یعنی فٹ ہوجاتے تھے اور جب بُرے حالات ہوتے تھے چاروں طرف سے لوگ آرہے ہوتے تھے کہ لاؤ ہمارے پیسے لاؤ اور کوئی ایسا شخص نہیں مل رہا ہوتا تھا جس سے لے کر دوسروں کو دے دیتے۔ تو وہ خوب کھا پی کر خود کو موٹا کرلیا کرتے تھے۔ یعنی کسی کو احساس نہ ہو کہ وہ فکرمند ہیں۔ یہ فلسفہ تو ان کا تھا۔ بدقسمت لیکن بےفکر آدمی تھے۔ مشکلات کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتے تھے۔ جن دنوں ہم بمبئی کے ایک فلیٹ میں اپنی محفل جماتے تھے۔ تو یہ بےفکری سے ہماری محفل میں شامل ہوتے تھے۔ تاش کھیلتے اور ہنستے ہنساتے تھے۔ لگتا تھا کوئی فکر نہیں ہے۔ حالاں کہ مجھے معلوم تھا کہ کتنی پریشانی میں ہوتے تھے۔ جو ملنے والا آتا تھا قرض خواہ ہی نکلتا تھا۔ اس زمانے میں لوگ بےدھڑک سود پر رقم قرض دے دیا کرتے تھے۔ ان کے تنگ کرنے کے طریقے بھی تھے۔ ان کا یہ تھا کہ کسی سے چھپتے نہیں تھے۔ کہتے کہ کوئی مسئلہ ہے تو آؤ بات کریں۔ وہ لوگوں کو مطمئن کرنے کا گُر جانتے تھے اور قرض خواہ بھی مطمئن ہوجاتا تھا کہ ہاں بھئی مشکل میں ہیں اور جب حالات ٹھیک ہوجائیں گے تو رقم بھی ادا کردیں گے اور وہ رقم ادا کردیتے تھے۔ میں نے یہ کاروباری اصول ان سے ہی سیکھے ہیں۔ مووی آرٹ میں وہ برابر کے پارٹنر تھے لیکن کبھی کسی معاملے میں دخل نہیں دیا ہاں مشورہ ضرور دیتے تھے۔

نعمان احمد : سنہا صاحب کے انتقال کے بعد اس ادارے کا کیا بنا؟

مرزا صاحب : سنہا صاحب کا انتقال لندن میں ہوا تھا۔ ان کی بیگم ساوتری اسے دیکھتی تھیں۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ دوسری بیگم ان کے ساتھ رہتی تھیں اور یہ جو ساوتری تھیں یہ کلکتہ میں بزنس دیکھا کرتی تھیں۔ ان سے کوئی سال پہلے میری فون پر بات ہوئی تھی۔ اس وقت تک وہ حیات تھیں۔ ان کے دل میں کوئی مسئلہ ہوگیا تھا۔ اب میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ حیات ہیں یا نہیں۔ کیوں کہ اس کے بعد ان سے میرا رابطہ نہیں ہوا۔ لیکن مووی آرٹ اب بھی کام کررہی ہے۔

کاشف زبیر : پاکستان آنے کے بعد آپ کے خاندان کو کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا؟

مرزا صاحب : جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ میں کلکتہ میں تھا۔ البتہ سینتالیس میں گھر والے دلی سے راولپنڈی، وہاں سے لاہور اور پھر کراچی چلے آئے تھے۔ کراچی میں وہ لوگ میرے بڑے بہنوئی ادریس خان کے گھر میں ٹھہرے تھے۔ وہ منسٹری آف ڈیفنس میں تھے اور انہیں مارٹن روڈ پر ایک کوارٹر ملا ہوا تھا۔ گھر والے البتہ چند مہینے وہیں رہے تھے۔ اس دوران میں میرے بڑے بھائی منظور احمد کچھ کام بھی کررہے تھے اور ساتھ ہی رہنے کے لئے کوئی جگہ بھی دیکھ رہے تھے کیوں کہ اس کوارٹر میں بڑی تنگی تھی۔ بھائی صاحب کی دوستی زین نورانی سے تھی ان کے علاوہ ہارون خاندان کے یوسف ہارون اور حمید ہارون بھی ان کے حلقۂ احباب میں تھے۔ انہوں نے منظور بھائی کے لئے کام بھی تلاش کیا اور مکان بھی دیکھتے رہے۔ بندر روڈ پر گرین اسٹریٹ میں مصطفیٰ مینشن نامی عمارت میں ایک فلیٹ خالی تھا۔ انہوں نے بھائی صاحب سے کہا کہ اس جگہ قبضہ کرلو۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تو ہمارے گھر والے اس میں اٹھ آئے۔ بعد میں جب بعض لوگوں کو علم ہوا کہ فلیٹ تو خالی تھا تو انہوں نے خوب اودھم مچایا۔ لوگ آتے تھے۔ دھمکیاں دیتے تھے۔ لیکن جب ان کی دھمکیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو چپکے ہوکر بیٹھ گئے۔ میری شادی اسی گھر میں ہوئی تھی اور کلکتے سے واپس آنے کے بعد میں اسی

فلیٹ میں رہا تھا۔ میں بھی کام کرنے لگا۔ دوسری طرف لوگ والد صاحب کا نام سن کر آتے تھے اور گھر پر ہی بے شمار کام دے جاتے تھے۔ اس طرح کام چلنے لگا اور جو بالکل ہی بے روزگاری کا زمانہ تھا، اس میں میں کلکتہ سے رقم بھیجا کرتا تھا۔

ایک صاحب ہیں پاکستان کے بہت بڑے انڈسٹریلسٹ ہیں۔ جب میں نے ایلیٹ پبلشر نیا نیا قائم کیا تھا تو یہ میرے پاس آئے تھے اور یہ آج بھی مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں چار منزل چڑھ کر تمہارے فلیٹ تک آیا تھا اور تم نے مجھ سے پیشگی چالیس روپے رکھوالیے تھے۔ ڈیزائن بنوائے تھے۔ یہ صاحب ہیں کوہ نور کیمیکلز کے چیئرمین عثمان اللہ والا کتنی بڑی شخصیت تھے اور خود چل کر میرے پاس آئے۔ یہ بات وہ آج بھی برملا سب کے سامنے کہتے ہیں۔ اس زمانے میں ہم نے ان کے لئے بہت سارے ڈیزائن بنا کر دیئے تھے اور ان میں سے بہت سارے ڈیزائن ہمارے ہاں چھپے بھی تھے۔ خاص طور سے تبت ٹیلکم پاؤڈر والا ڈیزائن جو ہے۔ وہ بھائی منظور نے بنایا تھا۔ اس میں ایک لڑکی کی تصویر کے گرد پھولوں کا حاشیہ ہے کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ برکت والا ڈیزائن آج تک نہیں بنا۔ میں نے تبت سنو کے ریپر چھاپے اس طرح اس کا جو پمفلٹ تھا اسے بھی میں نے ڈیزائن کیا اور چھاپا تھا اور اس کے میں نے پیشگی پیسے لئے تھے۔ ذاتی طور پر مجھے ان کا کام کر کے ہمیشہ خوشی محسوس ہوتی تھی۔

کاشف زبیر : نیشنل ایڈورٹائزر میں اپنی آرٹ ڈائریکٹر کی ملازمت کے بارے میں بتایئے؟

مرزا صاحب : اس زمانے میں کمپنی کو ایک آرٹ ڈائریکٹر کی ضرورت تھی اور مجھے کام کی۔ میں نوکری کا قائل نہیں تھا کیوں کہ کلکتہ میں اپنا کاروبار چھوڑ کر آیا تھا اور ضرورت مند بھی تھا۔ ایک دوست نے مجھے اس نوکری کے بارے میں بتایا تو میں وہاں چلا گیا۔ وہاں ایک صاحب تھے جی آر قریشی۔ یعنی غلام ربانی قریشی اور دوسرے ان کے پارٹنر تھے محمد مشتاق ان کا سنگاپور میں قالینوں کا بزنس تھا۔ وہ بھی بعد میں کراچی آ گئے تھے۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو فوراً پیش کش کر دی اور پانچ سو روپے تنخواہ مقرر کر دی۔ اس زمانے میں ایک کلرک کو مشکل سے چالیس پچاس روپے ملا کرتے تھے اور تین مہینے بعد میری کارکردگی سے اتنے مطمئن ہوئے کہ انہوں نے خود ہی میری تنخواہ میں سو روپے کا اضافہ کر دیا۔ میں نے انہیں کئی کمپین بنا کر دی تھیں اور اس سے کمپنی کو ہزاروں کے آرڈر ملے تھے۔ خاص طور سے فلپس اور پاکستان ٹوبیکو کمپنی کی جانب سے۔ اصل چیز ہوتی ہے ڈیزائن اور اس کی بنیاد پر کام ملا کرتا تھا۔ سلوگن وغیرہ بعض تو خود لکھا کرتے تھے اور بعض ہم سے لکھواتے تھے اور کلائنٹ اس پر کام دیا کرتا تھا۔ یعنی ڈیزائن بنا کر دینا بھی ایجنسی کی ذمّےداری ہوتی تھی۔ اس زمانے میں لگے بندھے کلائنٹ بھی نہیں ہوتے تھے بلکہ جو بھی اچھا کام کر کے دیتا تھا، سب اس کی طرف دوڑ جاتے تھے۔ اس زمانے میں گاہک کہتے تھے پہلے ڈیزائن دکھاؤ پھر بات کریں گے۔ اب ہوا یہ کہ کمپنی کے ڈیزائن چلے نہیں گاہک کو پسند نہیں آئے تو اس نے انہیں فیل کر دیا۔

اس وقت اورینٹ ائرویز کے نام سے ایک فضائی کمپنی تھی۔ اس کے ایک ایگزیکٹو ہمارے دفتر آیا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا میں برنس روڈ پر ایک مشین دیکھ کر آیا ہوں جسے بلاک اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ڈیزائن دے دو اور یہ چھاپ کر حوالے کردیتی ہے۔ میں نے سوچا یہ تو بڑی نایاب شے ہے، اس کی زیارت کرنی چاہئے۔ اس زمانے میں میرا دفتر بمبئی ہوٹل کے پاس تھا۔ اب یہاں کے ای ایس سی کا دفتر ہے اور میری رہائش بندر روڈ پر تھی۔ برنس روڈ درمیان میں پڑتا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں روز ہی پیدل دفتر آیا جایا کرتا تھا۔ میں نے سوچا راستے میں پڑتا ہے کسی دن اسے بھی دیکھتا جاؤں گا۔ ایک روز میں دفتر سے ذرا جلدی اٹھا تو وہاں پر چلا گیا۔ وہاں پر ایک جرمن صاحب بیٹھے تھے۔ یہ نومسلم تھے ان کا نام تھا مصطفیٰ جارج کینسی۔ میں نے ان سے کہا کہ ایک صاحب نے آپ کی مشین کے بارے میں بتایا ہے اور اس کی ایسی تعریف کی ہے۔ مجھے بتایئے کہ کیا یہ درست ہے۔ اس پر انہوں نے تین بار مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہنے لگا، تم کون ہو اور مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ اس پر میں نے انہیں بتایا کہ میں جے جے اسکول آف آرٹ سے پڑھا ہوں اور نیشنل ایڈورٹائزر کا آرٹ ڈائریکٹر ہوں۔ کلکتے میں اپنا آرٹ اسٹوڈیو چلاتا رہا ہوں۔ اس پر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا، بولا۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ مشین کو کوئی چیز نہیں چاہئے بلکہ میں نے کہا تھا کہ اسے بلاک کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا۔ یہ کہیے ناں کہ یہ لیتھوگرافی کی مشین ہے۔ میں نے اس سے دکھانے کو کہا تو وہ مجھے پردے کے پیچھے لے گیا جہاں روٹا پرنٹ رکھی تھی۔ یہ چھوٹی سی مشین تھی اور اس زمانے میں ڈیلی کیٹر کہلاتی تھی، آپ اسے چھوٹے سائز کی

آفسٹ مشین بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں پلیٹ بنانی پڑتی تھی اور اس پر کلر سیریشن کرنے پڑتے تھے تب کہیں جا کر یہ ڈیزائن چھاپا کرتی تھی۔

کاشف زبیر: یعنی یہ آج کے ڈپلی کیٹرز سے مختلف ہوتی تھی؟

مرزا صاحب: قطعی مختلف۔ اس زمانے میں اسے ڈپلی کیٹر کہا جاتا تھا۔ دراصل اتنے چھوٹے پیمانے پر کام کرنے کے بارے میں کوئی سوچتا نہیں تھا۔ چھپائی کی بڑی بڑی مشینیں ہوا کرتی تھیں۔

نعمان احمد: جیسے سولنا اور رولٹا کے ابتدائی ماڈل ہوا کرتے تھے۔

مرزا صاحب: روٹا ہی دراصل رولٹا تھی۔ یہ چھوٹی مشینیں لاتے تھے بلکہ اس وقت اس سے بھی چھوٹی ایک مشین آتی تھی اس کا سائز سترہ ضرب بارہ انچ تھا اور یہ کہلاتی بھی ڈپلی کیٹر تھی کیوں کہ اس پر کوئی اور کام تو ہو نہیں سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ تیز رفتاری سے سنگل کلر چھاپ دے۔ اگرچہ یہ ایک ہی کلر چھاپتی تھی لیکن آپ اسے طریقے سے استعمال کرتے تو یہ دوسرا، تیسرا بلکہ چوتھا کلر بھی چھاپ دیتی تھی۔

اگلے روز یہ بات لطیفے کے طور پر سب کو سنائی جا رہی تھی کہ بھئی مشین کو کچھ نہیں چاہئے۔ بس ڈیزائن دو اور یہ چھاپ دے گی۔ ہفتے بھر تک یہ مذاق چلتا رہا تھا۔ پھر ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ ابا جان پبلشرز کو جو طغرے وغیرہ بنا کر دیا کرتے تھے اس سے تو انہوں نے چھاپ چھاپ کر لاکھوں بنالئے۔ تو یہ کام میں خود کیوں نہیں شروع کر دیتا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ صرف مشین ہی پندرہ ہزار کی تھی اور ابھی تک میرے پاس اتنے پیسے جمع نہیں ہوئے تھے۔ سید شمس الدین صاحب مجھے بمبئی اور کلکتے سے جانتے تھے۔ وہ مووی آرٹ بھی دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ جمیل نوکری کرو گے یا کوئی کام کرو گے۔ میں نے جواب دیا۔ ارادہ تو اپنا کام کرنے کا ہے لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں اس پر انہوں نے کہا اچھا دیکھو میں کچھ کارڈ پبلش کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں تو تم شروع کرو میں تم سے کام لوں گا تو میں نے اللہ کا نام لے کر یہ ادارہ ایلیٹ پبلشر قائم کر دیا۔ وجہ میں بتا چکا ہوں کہ میں خالی پرنٹر نہیں بننا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے پبلشر کا نام چنا۔ یہ 1950ء کے آخر کی بات ہے۔ ابھی میں نے مشین نہیں دیکھی تھی۔ اکیاون کے شروع میں میں نے مشین دیکھی۔ ادارے کا اکاؤنٹ ڈھائی ہزار روپے سے کھولا گیا تھا اور کل چھتیس ہزار سے کام کا آغاز کیا۔ اس میں سے سولہ ہزار کی تو مشین آ گئی۔ اس میں فلسنگ کا خرچا بھی شامل تھا۔ باقی گودام کی مرمت اور دوسرے تیسرے کاموں میں لگ گئے۔ جب میں نے روٹا والوں کو مشین کے پیسے دیئے تو انہوں نے پروفنگ کے طور پر مجھے قائداعظم کی پنسل سے بنی تصویر چھاپ کر دی تھی۔ اس کے نیگیٹو لندن سے بن کر آئے تھے اور اس کی پلیٹیں وہیں تیار ہوئی تھیں۔ اب مجھے مشین لگانے کے لئے جگہ چاہئے تھی۔ ان دنوں الاٹ منٹ اپنے آخری مراحل میں تھی تو میں الاٹ منٹ کمشنر کے پاس جا پہنچا۔ چپراسی نے بتایا کہ صاحب تو میٹنگ میں ہیں کسی سے نہیں مل سکتے۔ میں نے کہا اچھا یہ تصویریں ہیں یہ لے جا کر اندر رکھ دو۔ وہ بھی قائداعظم کی تصویر سے بڑا متاثر ہوا تھا ورنہ اس سے پہلے گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔ اس نے تصویریں لے جا کر اندر دے دیں۔ کمشنر نے پوچھا یہ کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک صاحب آئے ہیں باہر، انہوں نے بھجوائی ہے انہوں نے کہا بلاؤ تو میں اندر گیا۔۔۔ اور کہا کہ جگہ چاہئے تو میں نے یہ تصویر دو جگہوں پر استعمال کی۔ ایک الاٹ منٹ کے وقت اور دوسرے پریس کے لئے ڈکلریشن لیتے وقت۔ اس کی برکت سے میرے دونوں کام آسانی سے ہو گئے تھے۔ کمشنر نے کہا یہ تو ہاتھ سے بنی ہے۔ میں نے کہا ہاں ہاتھ سے بنی ہے لیکن اب یہ چھپی ہوئی ہے۔ اس پر انہیں یقین نہیں آیا۔ میں نے کہا ربر لگا کر دیکھ لیجئے۔ کہنے لگے خراب ہو جائے گی۔ میں نے کہا نہیں ہوگی۔ میرے پاس اور بھی ہیں۔ جب میں نے ان سب میں اور تصویریں بانٹیں تو انہیں یقین آیا کہ یہ ہاتھ سے بنی ہوئی نہیں ہیں۔

نعمان احمد: اس پروفنگ کی کتنی کاپیاں چھپی تھیں؟

مرزا صاحب: کوئی ڈھائی تین سو کے قریب تھیں۔ جب میں نے سب کو تصویریں دیں تو صورتِ حال بدل گئی۔ کمشنر صاحب نے کہا الاٹ منٹ تو ہو گئی اب تو صرف کنفرمیشن جاتی ہے۔ لیکن آپ کے لئے کچھ کرنا پڑے گا لہٰذا آج کی یہ میٹنگ ملتوی کی جاتی ہے۔ مجھ سے کہا کہ درخواست دوں۔ میں درخواست لے کر نہیں گیا تھا۔ میں نے وہیں ہاتھ سے لکھ کر دے دی۔ اگلی میٹنگ میں انہوں نے کسی وکیل کو الاٹ کیے جانے والے ایک گودام کو مجھے الاٹ کر دیا۔ مجھ سے کہا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے جا کر اس کا قبضہ لے لوں۔ چابی تالے والے خصوصی طور پر شام کو آٹھ بجے آئے تھے۔ یہ کیلوں کا گودام تھا اور اس میں ہزاروں کا

بال بھرا ہوا تھا۔ الاٹ منٹ کے وقت مجھ سے کہا گیا۔ یہ تو نہیں ملے گا۔ حالاں کہ الاٹ منٹ بمعہ سامان کے دیا جاتا تھا۔ میں نے کہا مجھے تو دلچسپی نہیں ہے۔ لے لو میرا کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسید بناؤ۔ ایک فرضی رسید بنائی گئی۔ مجھ سے دستخط لئے اور سارا سامان وہاں سے اٹھوالیا اور سارا کھاپی کر برابر کردیا۔ جب میں اندر گیا تو واقعی وہاں کباڑ کا گودام تھا۔ فرش اس کا ناپید تھا اور زمین میں فٹ فٹ بھر گہرے گڑھے تھے۔ دیواریں سینڈ اسٹون کی تھیں جن پر پلاسٹر تک نہیں ہوا تھا۔ چھت لکڑی کی تھی اور اس پر آئرن راڈ کے شہتیر لگے تھے۔ لیکن مشین کے لئے ایک جگہ مل گئی تھی۔ میں نے باقی ساری رقم لگا کر بائیس بائی سولہ فٹ کے اس گودام کو درست کیا۔ فرش بھرا دیواروں پر پلاسٹر کرایا بجلی کی وائرنگ کروائی۔ غرض کہ ہر طرح سے تیار کرایا۔ اب میرے پاس کام شروع کرنے کے پیسے بھی نہیں تھے تو اس وقت میرے جو دوست تھے انہوں نے مجھے پاکستان ٹوبیکو کمپنی کا کام دلوادیا۔ میں نے انہیں بتایا میرے پاس پیسے نہیں ہیں تو انہوں نے مجھے کام شروع کرنے کے لئے رقم بھی دلوائی۔ یہ امین نورانی صاحب تھے۔ نورانی خاندان نے جنہوں نے مجھے کام دلوایا تھا۔ اس وقت ان کا ہنی ڈیو نام کا برانڈ چل رہا تھا۔ اسے پیلا ہاتھی کہتے تھے۔ اس کا ڈیزائن واحد صاحب نے بنایا تھا اور اس کی کلر سپریشن لندن میں ہوئی تھی اور وہ یہاں آ کر چھپا تھا۔ جرمن مصطفیٰ جارج کینسی یہی کررہا تھا۔ وہ یورپ سے کلر سپریشن بنوا کر یہاں لوگوں کو دیتا تھا۔ یہاں نہیں بناتا تھا پھر اس نے یہ کیا کہ اپنے بھائی اور اس کی بیوی کو یہاں بلوالیا۔ وہ دونوں اس مشین کے ماہر تھے۔ بھائی مشین کا ٹیکنیشن تھا اور بھاوج کلر سپریشن کی ماہر تھی۔

مزے کی بات ہے انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ کلر سپریشن ہوتا کیسے ہے۔ میں نے انہیں اپنے ڈیزائن دکھائے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ کہنے لگے یہ مشین اس قسم کے پرنٹ تو نہیں نکال سکتی، یہ اس کام کے لئے ہے ہی نہیں۔ ان کے پاس ایک ہی ڈیزائن اور رنگ کے نمونے تھے، کہنے لگے یہ چھاپو۔ تم کہاں اتنی مشکلوں میں پڑ رہے ہو۔ تم انہیں چھاپو گے کیسے میں نے کہا تم نے ہی تو بتایا تھا کہ یہ مشین چھاپ سکتی ہے۔ اب تو میں نے آرڈر بھی لے لیے ہیں۔ اس پر ایک لطیفہ ہوا میرے تایا نے سنا کہ وہ ایک ہی رنگ چھاپنا چاہ رہے ہیں تو بولے یہ تو طوطا پرنٹ ہے روٹا پرنٹ نہیں۔ کیوں کہ یہ کہتے ہیں کہ طوطا چھاپ لو ایک رنگ والا۔ لطیفے کے طور پر اس کا نام طوطا پرنٹ رکھ دیا تھا۔ وہ بڑی مشکل میں پڑ گئے تھے لہذا بہانے بازی شروع کردی کہ مشین والے کمرے میں بڑی ٹھنڈ ہوتی ہے اور میم کے لئے پتلون سلنے گئی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ ٹھنڈے ملک سے آئی تھی۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ پتلون سل کر آرہی ہے۔ کام اسے آتا نہیں تھا لہذا اسے ٹالنے کے لئے بہانے بازی کی جارہی تھی۔ میں نے کہا مارے گئے۔ اتنے آرڈر لے لئے تھے جو کچھ لندن سے بن کر آیا تھا وہ تو میں نے چھاپ دیا۔ کام نکالنے کے لئے میں یونیورسل بلاک کے نام سے ایک کمپنی کے پاس گیا۔ یہ اس زمانے کے مشہور بلاک میکر تھے۔ اس کے بعد ایکسپریس بلاک میکر کا نام تھا۔ یہ کلر بلاکس بنانے میں بہت ٹاپ کی کمپنیاں تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تم اس کے کلر سپریشن بنا کردو۔ بولے آفسٹ کے لیے۔ آج تک نہیں بنایا۔ میرے اصرار پر انہوں نے ایک بنا کر دیا۔ جو بالکل ہی خراب نکلا کیونکہ نہ تو مجھے، نہ فوٹو گرافر کو اور نہ ہی بلاک میکر کو اس کام کا پتا تھا۔ میں یہ بلاک لے کر چلا آیا پھر میں نے سوچا کہ یہ خراب تو ہے ہی اس پر تجربہ کر کے کیوں نہ دیکھ لیا جائے۔ تو جہاں رنگ کو ہلکا کرنے کی ضرورت تھی میں نے لال رنگ سے ڈوٹ دیئے اور جہاں رنگ گہرا کرنا تھا وہاں میں نے فیری سانائیڈ لگایا۔ تو اس کی ذرا سی شکل بنی تھی۔ اس سے میں نے جو سیکھا اس سے کام لے کر فوٹو گرافر کو سمجھایا کہ اسی طریقے سے اس کو ایکسپوز کرنا ہے۔ اس میں ایک کے بجائے چار پلیٹیں خراب ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں فلم نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ شیشے کی پلیٹیں استعمال کی جاتی تھیں۔ اسے لیٹ کرنا بے حد مشکل کام تھا اور پھر رنگ کا خیال رکھنا تو اور بھی مشکل تھا لیکن کام ہوگیا۔ اب میں نے پلیٹ میکنگ کا سامان لیا۔ اسے اپنے ہاں لا کر میں نے خود پلیٹ بنانا اور اس پلیٹ کو سینسٹائز کرنا شروع کردیا۔ اب میں نے یہ ترکیب کی کہ اسے روشنی کی مدد سے قابو کرتا تھا۔ جہاں زیادہ رنگ چاہیے وہاں زیادہ روشنی دیتا تھا اور جہاں کم روشنی دیتا تھا وہاں رنگ مدھم ہوجاتے تھے۔ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ میرے دونوں بازو گرمی دانوں سے بھر آئے تھے کیونکہ لائٹ کے نیچے کھڑے ہو کر کام کرنا پڑتا تھا لیکن جو کام میں نے اس وقت کیا، وہ بہترین تھا۔ اسے اتنا اچھا کام کہہ سکتے ہیں کہ اسے آج کے معیار کے مطابق رکھا جاسکتا ہے۔ میرے پاس جو مشین مین تھا۔ رفیق اس سے بھی یہی کام لے لیا کرتا تھا۔ وہ تجربے کار آدمی تھا اور اپنے کام کا ماہر بھی۔ پہلا سیزن تو اس نے بڑی فرماں برداری

سے کام کر کے گزارا تھا لیکن جب دوسرا سیزن آیا تو وہ پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے بعد میں بہت تنگ کیا تھا۔

اب میں اپنے پریس کا حال بیان کردوں سولہ بائی بائیس فٹ کے اس حصے کے تین ٹکڑے کیے گئے تھے۔ ایک آٹھ بائی دس کا۔ ایک آٹھ بائی سولہ کا۔ یہ آگے سے تنگ اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ درمیان میں دفتر تھا۔ تیسرا حصہ جو سب سے بڑا تھا مشین کے لیے مخصوص تھا۔ مشین کو جرمن فکس کر کے گئے تھے۔ یہ حصہ مکمل طور پر ائر کنڈیشنڈ اور ساؤنڈ پروف تھا۔ میرے دفتر میں بیٹھے بعض افراد پوچھا کرتے تھے کہ آپ نے مشین کہاں لگا رکھی ہے، اتنا زبردست انتظام تھا۔ ورنہ پریس مشین تو خاصا شور مچاتی ہے اگر چہ روٹا کم شور کرتی تھی لیکن پھر بھی یہ کم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی آواز چند فٹ کے فاصلے سے نہیں سنائی دیتی تھی۔ یہ حصہ میں نے بالکل صاف ستھرا کر کے رکھا تھا۔ جیسا کہ پریس کا دستور تھا بلکہ اب بھی ہے کہ کاغذ بکھرا ہے۔ سیاہی پھیلی ہے تو میں نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک روز میں وہاں گیا تو ہر طرف کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ میں کاغذ کے معاملے میں بے حد محتاط تھا۔ ویسے بھی میں ڈرائنگ اور اسکیچنگ کا آدمی تھا اس لیے کاغذ کی قدر جانتا تھا۔ دوسرے کاغذ ہمیں آسانی سے ملتا بھی نہیں تھا۔ یہ بہت ہی نفیس کینیڈین کاغذ تھا جو کوٹے کے تحت محدود تعداد میں ملا کرتا تھا اور مہنگا بھی ہوتا تھا۔ اس مشین میں کیونکہ نوزل ہوتی تھیں جن میں کاغذ بہت اٹکتا تھا تو یہ رفیق بجائے اسے صحیح کرنے کے کاغذ نکال کر پھینک دیتا تھا۔ ایک کے بجائے دس کاغذ پھینکتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ کاغذ احتیاط سے استعمال کرو یہ مہنگا بھی ہے اور آسانی سے نہیں ملتا اور یہاں یوں کاغذ بکھرے اچھے بھی نہیں لگتے۔ اگلی بار میں گیا تو وہاں پہلے سے زیادہ کاغذ بکھرے ہوتے تھے۔ میں نے کہا اس کا تو دماغ خراب ہوگیا۔

اس وقت مجھے آئی سی آئی کے کلینڈرز کا آرڈر ملا تھا۔ یہ بہت بڑا آرڈر تھا کوئی پچاس ہزار کلینڈرز چھاپنے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت بڑا کام تھا اور کلینڈر کی ڈلیوری کا وقت بھی کم ہوتا ہے۔ میں بڑا پریشان تھا۔ میں نے اس کا ذکر ابا جان سے کیا۔ انہوں نے کہا ایک اصول تو یہ ہے کہ ایسے آدمی کو رکھنا ہی نہیں ہے۔ چاہے کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ اس طرح تو سارا کام ہی رک جائے گا۔ وہ بولے دیکھو اللہ مالک ہے اس طرح وہ کام کرے گا نہیں اور تم بھی اس کی حرکتیں برداشت نہیں کرو گے تو کیا فائدہ اس کا۔ ان کی بات سن کر میرا دل مطمئن ہوگیا تھا۔ اب پچاس ہزار کلینڈرز کا کام پھیلا ہوا تھا اور کلینڈرز چھاپ کر بھی دینے تھے۔ میں نے جا کر پریس کا تالا کھولا صبح سب سے پہلے میں ہی جایا کرتا تھا اور وہاں سے نکلنے والا آخری آدمی بھی میں ہی ہوتا تھا۔ جب رفیق آیا تو میں نے کہا اپنا حساب کتاب کرواور جاؤ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ بے حد خوش ہوا کہ لو یہ تو خود پھنس گیا۔ میں جو چاہ رہا تھا اس نے وہی کیا اب یہ کل خود میرے پاس آئے گا اور خوشامد کر کے واپس بلائے گا۔ اس کی تنخواہ کا جو حساب کتاب بنتا تھا وہ اس نے لیا اور چلا گیا۔ خوش خوش۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ کر گیا اب میں دیکھوں گا تم اسے کیسے چھاپتے ہو۔ اس نے ترکیب یہ کی تھی کہ جتنے کلرز چھپے تھے۔ ان سب کی رجسٹریشن الگ الگ کر کے رکھی ہوئی تھی۔ اب اسے مکس کیا جاتا تو سارا کام ہی خراب ہوجاتا۔ یعنی آپ نے اگر ایک کاغذ دو ملی میٹر اِدھر کیا ہوا ہے اور دو ملی میٹر اُدھر تو یہ بات آپ ہی کو معلوم ہوگی۔ ناواقف تو اسے سیدھا سیدھا چھاپ دے گا۔ اور مس پرنٹ ہوجائے گا۔ اسی وقت اللہ میاں نے یہ بات دماغ میں ڈالی کہ اسے مکس نہ کرنے دینا۔ میں نے اس میں سے ایک ایک کاغذ لیا اور اسے مشین میں ڈال کر دیکھا تو اس کا کھیل مجھے معلوم ہوگیا تھا۔ اب اسے الگ الگ ہی چھاپنا تھا۔ ہر کاغذ الگ الگ لگانا تھا اور اسے گڈی کے حساب سے کرنا ہوگا۔ میں نے کر کے دیکھا اور پرنٹ بالکل صاف آیا تھا۔ اب مسئلہ تھا پرنٹر کا۔ میں اس کے لئے روٹا پرنٹ والوں کے پاس گیا کیوں کہ وہ اپنے ہاں نئے لوگوں کو تربیت بھی دیا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک غفور نامی شخص تھا۔ آدمی ڈل تھا لیکن سیکھا ہوا تھا۔ میں اسے لے کر آیا اس نے دیکھا اور بولا یہ تو میرے بس کا نہیں ہے۔ پھر ایک وکیل کا لڑکا تھا آصف علی، میں نے اسے بلایا۔ اس نے بھی مجھ سے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں نے کہا فکر نہ کرو میں کھڑا ہوں۔ مشین بھی میری ہے کاغذ بھی میرا ہے۔ تمہارا کام مشین کو چلانا ہے۔ اسے تو چلانا جانتے ہو ناں؟ کہنے لگا ہاں مشین تو چلانی آتی ہے۔ میں نے کہا تو کام کرو۔ تم چھاپو میں بتاتا ہوں کہ کس طرح چھاپنا ہے اور کتنا چھاپنا ہے۔ میں نے اسے گر کی بات بتائی کہ یہ چھ سات جو گڈیاں پڑی ہیں انہیں آپس میں مکس نہ کرنا۔ تو اس نے ہمت پکڑی اور پھر یہ کام کیا۔ یہ لڑکا آصف علی بعد میں مکینیکل انجینئر بنا اور اسے لندن کی ایک اچھی فرم میں اچھی قسم کی جاب ملی تھی۔ اس

کے والد وکیل تھے تو یہ وہاں میری فیکٹری میں بھی بہت وکالت کرتا تھا۔ (قہقہہ)

کاشف زبیر: شروع میں آپ کے ساتھ کتنے افراد تھے؟

مرزا صاحب: ایک تو رفیق تھا پرنٹر، ایک صغیر نام کا آفس بوائے تھا اور بہت محنتی اور بھلا مانس قسم کا شخص تھا۔ اور ایک میں تھا۔ یعنی کل تین افراد تھے۔ اس کے بعد دو چار آئے۔ پھر دو چار اور آئے۔ پریس جس عمارت میں تھا اسے نائن عرب بلڈنگ کہتے تھے اس کا مالک عبدالرحمٰن شاہین نامی عرب تھا۔ وہ اسمگلنگ کیا کرتا تھا اور اسی مقصد کے لئے گودام رکھے ہوئے تھے۔ جب وہ ضعیف ہوگیا اور کام وغیرہ ترک کر دیئے تو اس نے بقیہ گودام مجھے کرائے پر دے دیئے حتیٰ کہ پورا نچلا فلور میرے پاس آ گیا اور اس کے بعد اوپر والے فلور کا خاصا بڑا حصہ میرے پاس آ گیا کیوں کہ میرا کام پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

کاشف زبیر: آپ نے پریس کو سائٹ ایریا میں کب منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا؟

مرزا صاحب: 1959ء میں، میں نے یہ جگہ خریدلی تھی۔ اللہ کے فضل سے میں اس وقت تک اس قابل ہو چکا تھا۔ یہ ڈی ایٹ ون میں دو ایکڑ کا پلاٹ تھا۔ اس وقت بھی یہ خاصا مہنگا تھا تو صرف آٹھ برس بعد میں اس قابل ہوگیا تھا۔ اسی سال کے آخر میں وہاں تعمیر شروع کرادی تھی اور اگست 1960ء میں پریس وہاں شفٹ ہو چکا تھا۔ اس وقت میرے پاس کل ایک سو پچیس افراد تھے۔ اس زمانے میں پرنٹنگ پریس کے لحاظ سے یہ تعداد خاصی ہوا کرتی تھی بلکہ اب بھی پریس میں اتنے آدمی کام نہیں کرتے۔ جب میں نے سوا دو ایکڑ کا یہ پلاٹ خریدا تو لوگ پوچھا کرتے تھے کہ کیا وہاں فٹ بال کھیلو گے۔ پریس کا ہمارے ہاں یہ تصور رہا تھا کہ تھوڑی سی جگہ میں ہو۔ چلنے کی بھی جگہ نہ ہو۔ ہر طرف گندگی ہو۔ اس پر لوگوں کو یہ تعجب بھی تھا کہ یہ شہر سے اتنی دور جا کر بیٹھا ہے وہاں بھلا کون آئے گا۔ میں ان سے کہتا تھا۔ جنہیں ضرورت ہوگی وہ آئیں گے۔ تو وہاں جا کر میں نے اللہ کے فضل سے پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ سائٹ فیکٹری میں ایک صاحب کام کرتے تھے سیف الدین برہان، یہ پرنس برہان الدین کے بھتیجے تھے۔ جو اسماعیلیوں کے روحانی پیشوا ہیں۔ اب میں نے ان کی ایک حرکت سے پلیٹ کی کریکشن سیکھی۔ اسے جب چھٹی چاہئے ہوتی تھی تو پلیٹ خراب ہوجاتی تھی۔ وہ لے کر آتا کہ صاحب یہ۔۔۔پلیٹ خراب ہوگئی اور اس کا یہ رزلٹ آ رہا ہے۔ اب یہ دوبارہ بنے گی اور دوبارہ بننے کا مطلب تھا کہ روٹا پرنٹ والوں کے پاس جاؤ وہ کہتے تھے کہ دو گھنٹے بعد آنا۔ اس وقت تک چھٹی کا ٹائم ہوجاتا تھا۔ میں اس سے کہتا تھا ٹھیک ہے تم جاؤ اب چھٹی کرو کل ہی دیکھیں گے۔ جب دو تین بار ایسا ہوا تو مجھے فکر ہوئی۔ میں نے ایک بار جا کر دیکھا تو وہاں روئی پڑی تھی جو گیلی تھی اور پلیٹ پر گرینگ کا نشان تھا۔ میں نے سوچا یہ یقیناً تیزاب سے بنا ہے۔ اس سے گرینگ کا نشان بنا اور پلیٹ خراب ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ جہاں پر زیادہ تیزاب لگا تھا۔ وہاں سے بالکل اڑ گیا تھا اور جہاں ہلکا لگا تھا وہاں سے کم رنگ اڑا تھا۔ یہ چیز مجھے اچھی لگی...... میں نے کہا یہ تو بڑے کام کی شے ہے۔ میں نے اس کا پرنٹ نکال کر دیکھا تو صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ ہلکا ہے اور یہاں سے بالکل اڑ گیا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ جو میں کریکشن کرتا ہوں۔ لال رنگ سے اور بعض اوقات نہیں ہو پاتی تو وہ اس سے ہوسکتی ہے اور بعد میں نتیجہ دیکھ کر اسے درست بھی کیا جا سکتا ہے۔ کچھ تجربات کے بعد میں اسے سیکھ گیا۔ اگلے روز وہ آیا تو میں نے اسے کچھ نہیں کہا اور دوسری پلیٹ بنوا کر دے دی۔ کچھ عرصے بعد ضرورت پڑی تو میں نے اس کے سامنے یہ ترکیب کی۔ میں نے یہ کیا کہ پلیٹ کو ذرا سا یہاں سے صاف کیا اور ذرا سا وہاں سے اور اس سے کہا میں یہاں کھڑا ہوں اس کا رزلٹ نکال کر دکھاؤ۔ اس نے رزلٹ نکالا۔ اسے دیکھ کر میں نے اور درست کیا۔ وہ دیکھتا رہا اور شاید سوچتا رہا کہ اس کے ساتھ تو کوئی غلط چیز بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔ یہ اس میں سے بھی فائدہ نکال لیتا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ روز وہ چھٹی کے لئے ترکیبیں لڑاتا رہتا تھا اور میں پریشان ہوتا تھا۔

شروع میں میرے پاس تجربے کار افراد تھے، انہوں نے مجھے بے حد تنگ کیا تھا۔ لہٰذا میں نے نئے لڑکے لینا شروع کر دیئے تھے۔ ان کو سکھاتا بھی تھا اور ان سے کام بھی لیتا تھا۔ جب میں نے ان سے کام لینا شروع کیا تو ایک بڑے استاد جو پرنٹر تھے' ملنے آئے اور بولے آپ نے تو استادوں کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔ میں نے کہا وہ کیسے۔ بولے ان نئے لڑکوں کے کام لے کر اب ہمیں کون پوچھے گا۔ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ کام بڑا عجیب ہوا کرتا تھا۔ کام کرنے کے الگ ہی طریقے تھے۔ یعنی ہاتھ سے کام کرنے والے اور کیمیائی ماہر ایک ہی ہوا کرتے تھے اور لیتھو

گرافی کو بڑا کیمیائی مہارت کا کام سمجھا جاتا تھا کہ کتنا تیزاب لگے گا۔ کتنی سیاہی درکار ہوگی۔ بعد میں جب آفسٹ آیا تو اس میں کتنا ڈرائر ملایا جائے گا کیوں کہ بعض سیاہیاں ایسی تھیں کہ سوکھتی نہیں تھیں اور تیل بھی چاہئے۔ اس سے ہموار چھپائی آتی تھی۔ یہ سارے حربے استاد جانتے تھے اور نئے لڑکوں کو نہیں سکھاتے تھے۔ وہ شاگرد سے کہتے ذرا پان لے آؤ اور جب وہ پان لینے جاتا تھا تو یہ سیاہی میں مکسنگ کرتے تھے اور اسے کام کے قابل بناتے تھے۔ استاد اپنا فن چھپاتے تھے اور بے چارے لڑکے کہا کرتے تھے کہ ہمیں تو کچھ سکھایا ہی نہیں جاتا۔ میں ان سے کہتا کہ آؤ میں تمہیں سکھاتا ہوں۔ سب سے پہلی گر کی بات تو یہ ہے کہ ملانے والی چیز کم سے کم ملاؤ۔ اگر کم ہو بھی گئی تو اور ملائی جا سکتی ہے لیکن زیادہ ہوگئی تو کم نہیں ہوگی۔

کاشف زبیر: یعنی آپ نے استادوں کے راز فاش کردیئے (قہقہہ)

مرزا صاحب: استادوں نے بڑا شور مچایا کہ ہم نے تو پڑیاں بنا کر رکھی تھیں کہ یہ ملاتے ہیں اس میں تو کام ہوتا ہے اسی زمانے میں ایفی شینسی زیادہ ہوا کرتی تھی اور کام کم ہوتا تھا۔ پھر جل کر کہا کرتے تھے چلو یہ سب تو لڑکوں کو سکھا دیا لیکن جب پلیٹ میکنگ کا مرحلہ آئے گا تو استادوں کی ضرورت پڑے گی ہی۔ یہ کام تو پلیٹ سے ہوتے ہیں۔ اسے پلیٹ کون دے گا۔ یہ چٹکیاں کہاں سے لائیں گے۔ کون پریس والا ایسا ہے جو انہیں چٹکیاں دے گا۔ اب میں لڑکوں سے کہتا کہ کام کرو اور وہ کہتے لائیے پلیٹ دیجئے۔ تو یہ بڑا مسئلہ ہوگیا تھا۔ نئے لڑکوں کو سکھانے کے چکر میں مجھے بعض اوقات بہت زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود میں نے سکھانے سے ہاتھ نہیں روکا۔ اس سے مجھے فائدہ بھی بہت ہوا اور بعض بڑے اچھے کام کرنے والے لڑکے ملے تھے۔

1952ء کی بات ہے احمد نامی ایک لڑکا آیا۔ میں نے اسے کٹنگ مشین پر کام کرنے کو کہا۔ ان دنوں میرے پاس آئی سی آئی کے کلینڈرز کا آرڈر تھا اور مجھے کارکنوں کی اشد ضرورت تھی۔ میرے پاس نئی مشینیں آئی تھیں۔ میرے خیال میں ان پر کام کرنے کے لئے نئے لڑکے زیادہ موزوں تھے۔ یہ لڑکا احمد نیا تھا اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کا بڑا بھائی جو کٹنگ مشین کا ماہر تھا۔ حالاں کہ اسے رائٹ اینگل کرنا نہیں آتا تھا۔ یہ جدید قسم کی جاپانی کٹنگ مشین تھی اور اسے ذرا سا دھکا دو تو یہ اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی۔ میں نے ان لڑکوں کو رائٹ اینگل جاننے کی تربیت دی تھی کہ کس طرح کاغذ الٹ پلٹ کر اور اوپر نیچے رکھ کر درست زاویہ معلوم کیا جاتا ہے۔ میں نے یہ باتیں احمد کے بھائی کو سمجھائیں تو وہ بولا۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ہے احمد پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ صاحب میں کر کے دیتا ہوں۔ میں نے اسے اجازت دے دی ضرور کرو تو اس نے نہ صرف درست کام کر کے دیا بلکہ اپنے بھائی کو بھی سکھانا شروع کر دیا۔ حالاں کہ وہ اس کے مددگار کے طور پر آیا تھا۔ لیکن ذہین اتنا تھا کہ صرف دیکھ کر ہی کام سیکھ جاتا تھا۔ ایک وارنش مشین تھی جو مقامی طور پر تیارہ کردہ وارنش لیبل پر پھیرا کرتی تھی۔ کچھ دن بعد وہ وارنش مشین پر کام کرنے لگا حالاں کہ یہ آسان نہیں تھا اور اس کے بعد وہ پرنٹنگ مشین پر آ گیا تھا۔ اس معاملے میں وہ کراچی کا سب سے بہترین کارکن بن گیا تھا۔ احمد نے ریٹائرمنٹ تک ایلیٹ پبلشرز میں ہی کام کیا اور اس نے کوئی تیس بتیس سال نوکری کی تھی۔ پریس کے معاملے میں اس نے بہترین دماغ پایا تھا اور کام بھی پھرتی سے کیا کرتا تھا۔ وہ رفیق کے بالکل برعکس تھا۔ اس بے چارے کو کسی نے مے خانے کا راستہ دکھا دیا تھا۔ اس زمانے میں کسی کے پاس پیسے آ جاتے تھے تو وہ وہیں کا رخ کرتا تھا۔ اسے جس دن تنخواہ ملا کرتی تھی سیدھا شراب خانے جاتا تھا کیوں کہ اسے جتنی تنخواہ ملا کرتی تھی پورے پریس انڈسٹری میں کسی کو نہیں ملتی تھی۔ اس کے بڑے بھائی کو اس کی تنخواہ کا ایک چوتھائی ملتا تھا حالاں کہ وہ اس سے کہیں زیادہ سینئر تھا۔ مگر وہ ساری عمر اس کٹنگ مشین پر رہا تھا اور احمد کٹنگ مشین سے وارنش مشین پر آیا۔ اس سے پرنٹنگ مشین پر آیا پہلے ایک کلر کی چھوٹی مشین پر کام کیا۔ اس کے بعد بڑی مشین آئی تو اس پر بھی اس نے کام کیا۔

نعمان احمد: ایلیٹ کو ابتدائی زمانے میں کن اداروں یا افراد سے مقابلہ کرنا پڑا تھا؟

مرزا صاحب: حکومت کی طرف سے تو کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھار کسٹم والے اپنی من مانی پر اتر آتے تھے۔ ایک دفعہ روٹا پرنٹ کے لیے پلیٹ کو کوٹ کرنے کے کام آنے والا کیمیکل درآمد کیا۔ یہ جرمنی سے آتا تھا اور اس کا نام بھی جرمن زبان میں تھا۔ اسے استرا کو پارکیک کہا جاتا تھا۔ اس پر انگریزی میں لیکر بھی لکھا تھا۔ اس وقت جو کسٹم افسران تھے وہاں پر انہوں نے کہا یہ تو لیکر ہے جو نیل پالش میں کام آتا ہے۔ یہ آپ نے منگوایا ہے اور آپ اس کا غلط استعمال کریں گے۔

اتفاق سے اس کا رنگ بھی کچھ گلابی سا تھا۔ تو ان سے بڑا جھگڑا رہا تھا۔ وہ مانتے نہیں تھے۔ حالانکہ بڑی معمولی سی مقدار میں منگوایا تھا۔ پانچ چھ بوتلیں تھیں مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے کہ آپ نے اس لیے نہیں بلکہ اس لیے منگوایا ہے۔ اس وقت کسٹم ہاؤس میرے دفتر سے قریب ہی تھا۔ بمشکل دو سو گز کا فاصلہ ہوگا۔ میں کسٹم کے اسسٹنٹ کنٹرولر صاحب کے پاس گیا اور انہیں دعوت دی کہ آپ میرے پریس آیئے.......... اس کیمیکل کی کچھ مقدار میرے پاس ہے اور استعمال بھی ہو رہا ہے۔ اتفاق سے وہ بھلے آدمی تھے میرے پریس میں آئے اور دیکھا، بولے واقعی آپ درست کہہ رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ لیکر اس کام میں بھی آتا ہے۔ تو وہاں سے مجھے کیمیکل ملا تھا۔ اس طرح مجھے کئی بار اور بھی تنگ کیا گیا تھا۔ جیسے پریس میں کام آنے والے چند کیمیکلز ایسے تھے جن کا فلیش پوائنٹ زیادہ تھا اور معمولی سے زیادہ حرارت سے بھڑک اٹھتے تھے۔ اب جرمن ان پر سب لکھ دیتے تھے۔ اب کسٹم والوں نے اسے بھی روک لیا کہنے لگے۔ اس کا فلیش پوائنٹ اتنا زیادہ ہے اور یہ اتنی گرمی برداشت کرتا ہے اور یہ تو پوری عمارت اڑا دے گا۔ اس کے لیے تو آپ کو ایکسپلوزو والوں سے اجازت لینی پڑے گی کیونکہ یہ دھماکا خیز مادوں کی کیٹگری میں آتا ہے۔ غرض کہ اس پر بھی خوب فساد ہوا تھا۔ لکھ لکھ کر اور کہہ سن کر بمشکل اجازت ملی تھی۔ اس تجربے کے بعد میں نے روٹا پرنٹ والوں سے کہا کہ تم نے جرمنی میں جو لکھنا ہے لکھا کرو لیکن یہاں کے لیے صرف پریس کیمیکل لکھ دینا کافی ہے ورنہ مسئلہ ہو جائے گا۔

بیورو کریسی کا وتیرہ رہا ہے کہ ہمیشہ شک کرتے ہیں کہ یہ چیز منگوائی ہے تو غلط مقصد کے لیے منگوائی ہے اور یہ کہ کہتے کچھ ہیں اور منگواتے کچھ ہیں۔ نام کچھ اور ہوتا ہے اور درحقیقت چیز کچھ اور ہوتی ہے۔ جہاں تک مارکیٹ میں مقابلے کا تعلق ہے۔ جس زمانے میں میں نے کام شروع کیا، اس زمانے میں ایک بہت بڑا پریس شروع ہوا تھا کٹوریہ روڈ پر پروسیس پاکستان کے نام سے۔ بڑا سرمایہ لگایا تھا ان لوگوں نے۔ جدید ترین مشینیں خرید کر کام شروع کیا۔ تو لوگوں نے مجھ سے کہا تم اتنی سی روٹا پرنٹ خرید کر کیا کام کرو گے۔ انہوں نے اتنی بڑی مشینیں لگا رکھی ہیں۔ میں نے ان سے کہا دیکھو میں کسی سے مقابلہ نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے ادارے کا نام بھی ایلیٹ پبلشر رکھا ہے۔ میں اپنے والد اور بھائی کے کام کو چھاپنا چاہتا ہوں۔ لہذا مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے جو کام میں کرنا چاہ رہا تھا وہ پاکستان میں کوئی کرتا ہی نہیں تھا یوں بھی مقابلے کا سوال سامنے نہیں ہوتا تھا۔ بے شک اس پریس نے بڑی مشینیں لگا رکھی ہوں۔ آدمی بھی انہوں نے اچھے سے اچھے رکھ لیے ہوں گے لیکن ان کے پاس وہ کام نہیں ہوتا تھا جو میرے ہاں چھوٹی سی مشین پر ہوتا تھا۔ آرٹ، کلر سپریشن اور پرنٹنگ کی مدد سے۔ وہ ان کے ہاں نہیں ہوتا تھا۔ لہذا کمپیٹیشن کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانیاں لیبر کی طرف سے ہوئیں۔ میرے اپنے آدمیوں نے مجھے سب سے زیادہ تنگ کیا۔ 1956ء میں ایک پریس... انٹرنیشنل پیکجنگ کے نام سے سامنے آیا۔ انہوں نے یہ ترکیب کی کہ بہت زیادہ پیسے دے کر میرے آدمیوں کو توڑ لیا۔ وہ میرے سب سے بہترین کاریگر تھے اور ان کے جانے سے میرے کام پر بہت زیادہ فرق پڑا تھا۔ اس واقعے نے مجھ پر بہت برا اثر ڈالا تھا اور میں نے بددل ہو کر نئے لوگوں کو سکھانے کا کام ملتوی کر دیا تھا۔ حالانکہ میری کوشش ہوتی تھی کہ جہاں ایک مشین ہو تو وہاں دو تین کو کام سکھانے کی کوشش کروں۔ تا کہ ایک آدھ کے جانے سے فرق نہ پڑے۔ حالانکہ سنیئر استاد نئے آنے والوں کو سکھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کی روزی پر اثر پڑے گا۔ میں ان سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ نئے لڑکوں کو سکھاؤ اور اطمینان رکھو تم جب تک یہاں ہو میں خود سے تمہیں نہیں نکالوں گا۔ تمہاری نوکری کی گارنٹی دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں ان سے کہتا تھا دیکھو تم صدر دروازے سے آئے ہو موری کے رستے سے نہ جانا۔ یہ ہمارے ہاں دلی میں ایک محاورہ بولا جاتا تھا کہ کاریگر تنگ کرتا تھا کہ مجھے نکال دو۔ یہ موری کا راستہ کہلاتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ تھی کام خراب کرو، گڑبڑ کرو اور مجبور کر دو کہ انہیں نکال دیں تاکہ بعد میں وہ کہہ سکیں کہ ہم تو نہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے خود نکالا ہے۔ وہی حرکت جو شروع میں رفیق نے میرے ساتھ کی تھی۔ میں نے جن کو سکھایا، ان سے بھی یہی کہا دیکھو تم صدر دروازے سے آئے ہو عزت دار ہو۔ صدر دروازے سے ہی جانا موری کا راستہ اختیار نہ کرنا اور جب وہ سب چلے گئے تو مجھے بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ اگرچہ کام رکا نہیں کیونکہ دوسرے لڑکے جن کو میں نے سکھایا تھا، موجود تھے۔

اس زمانے میں میرے ساتھ واقعہ ہوا جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ ان دنوں ہم پی ای سی ایچ ایس میں کرائے کے

مکان میں رہ رہے تھے۔ گھر میں ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ وہاں چمپا کا ایک پودا موجود تھا جو اس زمانے میں کراچی میں نیا نیا آیا تھا۔ ابا جان خاص طور سے اس کی بڑی دیکھ بھال کرتے تھے۔ پانی دیتے روز آکر دیکھا کرتے مگر وہ بڑھ نہیں رہا تھا اپنی جگہ ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ ہمارا ایک چوکیدار تھا عبدالکریم بلوچ۔ وہ بہت اچھا اور شریف آدمی تھا۔ رات کو چمپا کے پودے کے پاس بلیاں لڑ رہی تھیں، اس نے ان کو بھگانے کے لیے لکڑی کھینچ کر ماری۔ لکڑی پودے کو لگی اور اس کا اوپری حصہ ٹوٹ گیا۔ تو عبدالکریم صبح ہی صبح میرے پاس آیا کہ صاحب بڑے صاحب جی پودے کو روز دیکھتے تھے اور اس کی دیکھ بھال کرتے تھے وہ مجھ سے ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا تم نے بہت اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا۔ والد صاحب اس قسم کے آدمی تھے کہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ فلاں کام خراب ہوا ہے اور ایسے ہوا ہے تو خاموش ہو جاتے تھے کچھ نہیں کہا کرتے تھے۔ ورنہ غصہ کرتے تھے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ ناشتے کی میز پر میں نے انہیں بتا دیا کہ رات بلیاں لڑ رہی تھیں۔ عبدالکریم نے لکڑی کھینچ کر ماری جس سے چمپا کا پودا ٹوٹ گیا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں۔ اس کے کوئی دس بارہ دن بعد اس پودے کے ٹوٹے ہوئے حصے سے کئی شاخیں نکلیں یعنی ایک کے بدلے کئی تو میں نے سوچا قدرت تو بڑی فیاض ہے، میں چند لوگوں کے جانے سے پریشان ہو رہا تھا اور قدرت نے ایک شاخ کے بدلے کوئی درجن بھر شاخیں نکال دیں اور مرجھایا ہوا پودا بھی ہرا بھرا اور سرسبز و شاداب ہو گیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے اس بات کو چالیس برس سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا کہ کوئی آیا یا کوئی گیا۔ میں نے لوگوں کو سکھانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اگر میں ایسا کرتا تو شاید لوگ میرے پاس سے بھاگ جاتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے بہت بڑا انعام تھا۔ اس واقعے کی یادگار کے طور پر اس چمپا کا پودا آج بھی میری فیکٹری کے دروازے پر لگا ہوا ہے۔ لوگوں کو سکھانے کا انعام یہ بھی ملا کہ میں برابر ترقی کرتا رہا۔

میرے پاس جنید شیخ نام کا ایک لڑکا روٹا پرنٹ پر کام کرتا تھا۔ بعد میں وہ امریکا چلا گیا اور جب 1964ء میں، میں پہلی بار امریکا گیا تو میں اس کے پاس بھی گیا۔ اس نے ایک اونچی عمارت کی تیسری منزل پر پرنٹنگ پریس قائم کر رکھا تھا۔ یعنی وہاں انڈسٹریل ایریا میں فیکٹریاں کئی کئی منزلہ عمارتوں میں قائم ہوتی ہیں۔ یہ عمارتیں اتنی اچھی اور اتنی مضبوط بنی ہوتی ہیں۔ خاص طور سے مشینوں کے لیے انہوں نے جو عمارتیں بنائی ہیں، وہاں اتنی بڑی بڑی اور زیادہ طاقت کی مشینیں چلنے کے باوجود یہ حال ہے کہ ایک سے دوسرے کو خبر نہیں ہوتی۔ ورنہ عام طور سے اگر ایک عمارت میں اتنی بڑی اور تیز رفتار مشینیں چل رہی ہوں تو اوپر نیچے سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میرا سکھایا ہوا ایک نوجوان امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں اپنا کاروبار چلا رہا تھا۔ اس طرح میری فیکٹری کے کچھ افراد سعودی عرب چلے گئے جہاں سے بدلے میں یہ کام شروع ہوا۔ کچھ دبئی گئے اور بعض تو جرمنی چلے گئے۔ حالانکہ جرمنی مہارت میں ہم سے بہت آگے ہے۔ لندن میں آصف علی نام کے لڑکے کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جو روٹا پرنٹ پر کام کرتا تھا۔ وہ بعد میں مکینکل انجینئر بن گیا تھا اور لندن کی ایک بڑی فرم میں کام کرتا تھا۔ وہ اب تک ملنے آتا ہے اور اس نے بہت ترقی کی ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ میرے سکھانے آدمی جہاں بھی گئے، کامیاب رہے تھے۔ جہاں تک اس ادارے کا سوال ہے جو میرے آدمی توڑ کر لے گیا تھا...... وہ ان سے کام نہیں لے سکا اور ادارہ بند ہو گیا۔

قائداعظم کے پرسنل سیکریٹری سید مطلوب الحسن صاحب 1954ء میں پرنٹنگ کی صنعت کے سرکردہ افراد میں تھے۔ ان سے وفاقی وزیر برائے صنعت جناب ابراہیم رحمت اللہ نے فرمائش کی کہ وہ دو طرح کے پریس دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک تو لیٹر پریس اور دوسرا آفسٹ۔ یہ آفسٹ مجھے دکھاؤ۔ اس زمانے میں کراچی ملک کا دارالخلافہ تھا اور تمام وزیر یہیں ہوا کرتے تھے۔ جناب مطلوب الحسن صاحب انہیں ایک تو لیٹر پریس میں لے گئے۔ جو میکلوڈ روڈ پر تھا اور پھر وہ انہیں ایلیٹ پبلشر میں لے کر آئے تھے۔ اس وقت تک میں پریس کو چار پانچ اور گودام لے کر وسیع کر چکا تھا۔ انہوں نے دیکھا تو بہت تعریف کی تھی۔ حالانکہ زیادہ بڑا پریس نہیں تھا۔ میرا کام بلا مقابلے کے آگے بڑھا تھا کہ میں معیار پر کوئی سمجھوتا نہیں کرتا تھا۔ دوسرے ادارے بعض اشیا چھاپنے سے انکار بھی کر دیتے تھے اور وہی اشیا میں چھاپ رہا تھا۔ اس زمانے میں میرے پاس چند مستقل گاہک تھے جن کا سارا کام میں کر کے دیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ تمہیں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے کہ میں یہ کام کہیں اور سے لے لوں۔ تم ہمارا سارا کام کر کے دے سکتے ہو۔ میں تین چار مہینے اور بعض اوقات چھ مہینے بعد بھی کام کر کے دیتا تھا۔ میرے گاہک انتظار کیا کرتے تھے

بجائے اس کے کہ کہیں اور سے کام کروائیں۔ شروع میں جب میں کسی سے کہتا تھا کہ وہ چند مہینے بعد آئیں تو وہ بھاگ جایا کرتا تھا پھر وہ دوسروں کے پاس جاتا تھا اور جب کام نہیں ہوتا تھا تو واپس میرے پاس آتا تھا اور میں ہی اس کا کام کرکے دیا کرتا تھا۔ یوں کام بڑھتا چلا گیا۔ ایک مشین سے دوسری مشین لی پھر میں نے لیٹر پریس کی مشین لی۔ جب وزیر صاحب پریس کے دورے پر آئے تو اس کے بعد حکومت نے اعلان کیا کہ پریس والوں کو مشینوں اور خام مال کے لائسنس دیئے جائیں گے۔ اتفاق سے اس سے ذرا پہلے مشرقی پاکستان میں کرنافلی پیپر مل نے پیداوار شروع کی تھی۔ تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ صرف مشینوں کا لائسنس مانگو، کاغذ تو اپنے ملک میں ہے۔ اس طرح مشینوں کے لائسنس زیادہ مل جائیں گے کہ ہم خام مال کا لائسنس نہیں مانگ رہے۔ اب ہوا یہ کہ جن کو ایک کی ضرورت تھی انہوں نے دو لائسنس مانگ لیے اور سو کے بجائے پانچ سو کا خام مال مانگ لیا۔ انہوں نے آرٹ پیپر منگوایا اور اسے ... بلیک کیا۔ بعد میں علم ہوا کہ کرنافلی میں اچھے کاغذ کے بجائے صرف موٹا کاغذ بنانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ تو اب مجھے اچھا کاغذ بلیک میں ان ہی سے خریدنا پڑا جو میرے کاروباری حریف تھے۔ اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے کاغذ کی کیٹیگریز بنائی تھیں جو کوئی دس سال تک برقرار رہی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے کاغذ تو جنرل لائسنس میں ڈال دیا تھا۔ تو ہمیں ہنگامی طور پر کاغذ بلیک میں بہت مہنگے داموں ان ہی لوگوں سے خریدنا پڑا تھا جو ہمارے مقابلے پر تھے۔ وہ کام نہیں کرتے تھے بلکہ اس طرح خرید کر بلیک کیا کرتے تھے۔ یوں ایلیٹ میں اس طرح کے مسائل آتے رہے اور ان کے حل بھی نکلتے رہے۔

کاشف زبیر: ایلیٹ پبلشرز کو قائم ہوئے پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں آپ نے پریس کی صنعت میں تکنیک، کیمیا اور انسانی مہارت کے حوالے سے کیا تبدیلیاں محسوس کی ہیں۔

مرزا صاحب: 1950ء سے پہلے پرنٹنگ پریس کو چلانا بڑا اہم کام تصور کیا جاتا تھا کیونکہ جو کام اچھے ہوتے تھے۔ وہ باہر سے بن کر آیا کرتے تھے۔ یعنی انہیں انگلینڈ سے بنوا کر منگوایا جاتا تھا اور پھر یہاں پر پرنٹ کرلیا جاتا۔ بمبئی میں ہاف ٹون اور آفسٹ کے کام اچھے ہوتے تھے۔ پاکستان میں اس وقت یہ سب بالکل ہی ناپید تھا۔ اس وقت مشین چلانے والے کو بہت اہم سمجھا جاتا تھا لیکن جب یہاں پر اچھے کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو کلر سپریشن کی ڈیزائننگ اہم شعبہ بن گئی تھی۔ ایلیٹ کے ترقی کرنے کی بنیادی وجہ ہی یہ تھی کہ ہم نے سب سے پہلے کلر سپریشن کا کام کیا تھا۔ اس کام کو کرنے کے ساتھ میں آرٹسٹ بھی بنا اور اپنے ہی کام کا ناقد بھی کیونکہ اور کوئی تھا نہیں اس شعبے میں۔ کام کیسے ہو اور اچھا کیسے ہو۔ یہ چیز خاص اہمیت کی حامل تھی۔ یہ سارے کام میں ہمیشہ اکیلے تو نہیں کرسکتا تھا کوئی اور اسے سیکھنے کو تیار نہیں تھا۔ ہاں معمولی نوعیت کے فنی کام سب کرنا چاہتے تھے۔ 1964ء میں میں نے پہلا کلر اسکینر لیا۔ اس کے بعد کلر سپریشن کا کام آسان ہوگیا تھا۔ یعنی جو اس مشین کا آپریٹر تھا۔ وہ پرنٹر سے زیادہ اہم ہوگیا۔ اس کا کام تھا کہ کسی بھی ڈیزائن کی کلر سپریشن کرکے اسے دے۔ اس کے بعد پرنٹر کا کام بہت آسان تھا۔ اسے بس چھاپنا ہوتا تھا۔ میں جو کام ہاتھ سے کرتا تھا مشین وہی کام زیادہ آسانی سے زیادہ اچھا اور تیزی سے کرنے لگی تھی پھر 1974ء میں دوسرا کلر اسکینر لیا جو پہلے والے سے کوئی دس گنا تیز چلتا تھا۔ اس کلر اسکینر پر ہم نے امریکا کی ایک گریٹنگ کارڈ کمپنی کے ڈیزائن کی کلر سپریشن بنا کر دی تھی۔ اس سے پہلے وہ یہ کام انڈیا میں ایک کمپنی ویلکم انڈیا سے کرواتے تھے۔ یہ بھی بڑی تعجب خیز بات تھی کہ امریکا والے ہم سے کام کروا رہے تھے۔ وہ اپنی مارکیٹ کے حساب سے ڈیزائن بھیجا کرتے تھے۔ 1984ء میں میرے پاس تیسرا کلر اسکینر آیا۔ اس وقت تک پورے پاکستان میں کسی ادارے کے پاس ایک بھی اسکینر نہیں تھا جبکہ ہمارے پاس تین استعمال ہو رہے تھے۔ تیسرا کلر اسکینر بہت زیادہ جدید قسم کا تھا اور اس کے آنے کے بعد میں نے پہلی بار دوسروں کا کام بھی کرکے دیا۔ خاص طور سے ڈائجسٹوں کے کورز اور ٹائٹل کے کلر سپریشن بنا کر دیے۔ اس سے پہلے یہ آفسٹ میں چھپا کرتے تھے۔ اس سے معیار میں حیرت انگیز بہتری آئی تھی۔

کاشف زبیر: آپ نے درست کہا۔ 1985ء کے بعد سے ڈائجسٹوں اور رسائل کے ٹائٹل کے معیار میں بہت زیادہ بہتری آئی ہے۔

مرزا صاحب: میں سب رنگ اسی طرح سے اور کئی دوسرے رسائل کے ٹائٹل بنا کر دیا کرتا تھا پھر وہ اسے چھپواتے تھے۔ ان کا معیار خود بخود بلند ہوا تھا۔ اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ یہ کتنے کام کی چیز ہے کیونکہ اس وقت تک کلر سپریشن نہیں بنتے تھے۔ اس لیے معیار اچھا نہیں تھا

لیکن جب میں نے ایک رسالے کے ٹائٹل کا کلر سپریشن بنا کر دیا اور اس کا رزلٹ سامنے آیا پھر سب ہی اس طرف دوڑ پڑے تھے۔ جب میں نے تیسرا اکلر اسکینر کامیابی سے چلایا اور لوگوں نے اس کا نتیجہ دیکھا تو انہیں خیال آیا کہ یہ تیسرا چلا رہا ہے اور ہم نے ابھی پہلا ہی استعمال نہیں کیا ہے پھر دوسروں نے بھی کلر اسکینر لگانے شروع کیے۔ اب اس کا حال پرنٹنگ مشین جیسا ہے یعنی ہر جگہ موجود ہے۔ اس سے پرنٹنگ کا معیار بلند ہوا تھا اور اب آٹو کلر سپریشن ہو جاتا ہے۔ اس سے معیار ایک دم ہی یورپ اور امریکا کے برابر جا پہنچا ہے خاص طور سے کلینڈرز اور چکنی سطح کی طباعت میں۔

کاشف زبیر: "پرانے اور نئے طریقہ کار میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب: جناب پرانے طریقہ کار میں یہ تھا کہ میں ہاتھ سے بیٹھ کر درست کیا کرتا تھا۔ جس زمانے میں مجھے آئی سی آئی کے کلینڈرز کا آرڈر ملا تھا اور میں سلائیڈز پر آئی گلاس لگا کر جب سرخ روشنائی سے کام کرتا تھا تو میری آنکھیں دکھنے لگتی تھیں۔ سرخی آجاتی تھی اور پانی بہنے لگتا تھا لیکن کام کرنے کا شوق بھی بہت تھا۔ اس کا صحت پر بھی اثر پڑتا تھا۔ میں نے بتایا کہ اس سے میرے بازوؤں پر گرمی دانے نکل آتے تھے اور اس کام پر اتنا وقت لگانا پڑتا تھا کہ اگر کلر اسکینر نہ آتا تو شاید میری آنکھیں ہی ختم ہو جاتیں۔ کیونکہ اس میں بہت احتیاط سے دیکھنا پڑتا تھا۔ ذرا فیری سانائیڈ یا لال رنگ زیادہ یا کم ہونے سے پلیٹ خراب ہو جاتی تھی۔ اس بنا پر آئی گلاس مسلسل آنکھ پر لگا کر رکھنا پڑتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کلر اسکینر نے میری ذات پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

کاشف زبیر: یہ دستی مہارت کا کام تھا جو اب مشین نے شروع کر دیا ہے۔

نعمان احمد: کمپیوٹر کو ایک آلے کے طور پر آپ نے کب استعمال کیا اور کس مقصد کے لیے کیا۔ کیونکہ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نئی مشینیں سب سے پہلے استعمال کرتے ہیں؟

مرزا صاحب: الیکٹرانکس سے شروع سے لگاؤ ہے مجھے۔ **1962**ء میں میں ایک ایگزی بیشن میں گیا جہاں پر پرنٹنگ مشینوں کی نمائش ہو رہی تھی۔ وہاں میں نے ایک جدید مشین دیکھی تھی لیکن ہمارے ہاں یہ **1964**ء میں آئی تھی۔ اس زمانے میں زرمبادلہ کا حصول اور ایل سی کا چکر خاصا مشکل تھا۔ اس زمانے میں کمپیوٹر تو تھا نہیں البتہ اس سے ملتی جلتی مشینیں آگئی تھیں لیکن یہ بہت سست اور خاصی مہنگی تھیں۔ ہمارے ہاں انہیں لانا اور استعمال کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کے لیے تکنیکی مہارت کی ضرورت تھی جو اس زمانے میں ہمارے ہاں نایاب تھی۔ **1979**ء میں جب میں امریکا گیا تو میں نے وہاں سے بھی کوشش کی کہ پرسنل کمپیوٹر پاکستان لاسکوں اور یہاں اس کا استعمال کروں لیکن اس وقت بھی معلوم ہوا کہ اس کے پروگرام نہیں مل رہے ہیں اور اس پر اسپیشل پروگرام ہی کام کرتے ہیں۔ جن کا استعمال کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی پھر بیک اپ سروس بھی نہیں میسر تھی پھر **1983**ء میں میرے چھوٹے صاحب زادے اویس تعلیم مکمل کر کے امریکا سے آئے۔ تو انہوں نے سب سے پہلے ایلیٹ میں کمپیوٹر رائج کیا اور اس کا آغاز اکاؤنٹنگ کے ڈیپارٹمنٹ سے کیا تھا لیکن اکاؤنٹس کا یہ حال تھا کہ وہ اسے اپنا رقیب سمجھ رہے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس کے آجانے سے ان کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ اب کمپیوٹر تو آگیا تھا لیکن وہ نہ تو اسے استعمال کر رہے تھے اور نہ ہی سیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ان کے خیالات غلط تھے۔ ہمارے جو چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ انہوں نے اویس کو بہت تنگ کیا تھا۔ انہوں نے سرے سے سیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے اور دس خامیاں نکالتے تھے لیکن ایک روز انہوں نے اپنے رویے پر معافی مانگی تھی۔ انہوں نے اویس سے کہا۔ میں نے آپ کو بہت ستایا ہے اور یہ کمپیوٹر تو ہمارے فائدے کی چیز ہے اس سے بہت آسانی ہے اللہ انہیں جنت نصیب کرے اب تو ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کوئی بات نہیں اب شروع کر دو پھر یہ ہوا کہ میں ایگزی بیشن میں جاتا تھا ہر سال۔ تو درجہ بدرجہ میں نے اسکینر اور کلر سپریشن کو کمپیوٹرائزڈ ہوتے دیکھا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ اب جو کلر کریکشن ممکن ہے وہ اس سے پہلے والے اسکینر میں ممکن نہیں تھی۔ ہر نئی چیز کو لانے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اس کے اخراجات شروع میں زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ یہی بات میں نے نوری نستعلیق کے بارے میں کہی کہ اس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ الیکٹرانکس میں یہ خوبی ہے کہ اس کی مصنوعات مسلسل سستی اور معیار میں بہتر ہوتی جاتی ہیں۔ میرے بیٹے اویس نے ایم، اے کے امتحان میں ایک کیلکولیٹر خریدا تھا جو چار ہزار روپے کا تھا اس زمانے میں اور سائز میں ٹائپ رائٹر کے برابر تھا۔ **1980**ء میں ہی

دنیا کے چند نامور

پڑھاکو اور حفاظ

احمد صغیر صدیقی

آلڈس ہکسلے... انگلش لٹریچر کی ایک بہت مشہور شخصیت ہے۔ کہتے ہیں، وہ بھی بہت تیز رفتار قاری تھا۔ عمر کے آخری حصے میں اس کی نظر بہت کمزور ہوگئی تھی اور یہ صرف اس کی بے پناہ پڑھائی کی وجہ سے ہوا تھا۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

آرچ بشپ آف کنٹربری ولیم ٹیمپل... کو بھی قدرت نے اسی فوٹوگرافک میموری سے سرفراز کر رکھا تھا۔ اسی طرح سڈنی ویب بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک صبح وہ کام پر نہیں گیا کیونکہ اسے زکام ہوگیا تھا۔ وہ ایک سیٹی پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک کتاب جس کا نام تھا "معاشیات کے اصول" پڑھنے لگا، یہ کتاب خاصی ضخیم تھی۔ دو گھنٹے میں اس نے نہ صرف اسے پوری طرح پڑھ لیا بلکہ اسے اس کے اندر لکھے ہوئے بہت سے اصول لفظ بہ لفظ یاد بھی ہوگئے تھے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اے۔ ای ڈ یلسن... ایک ناول نگار تھا۔ اس کی قوتِ حافظہ بہت تیز تھی۔ وہ کبھی اپنے کام کے کوئی نوٹ وغیرہ نہیں بناتا تھا بلکہ اپنے ناولوں کے کرداروں، واقعات وغیرہ کو اپنے ذہن میں لکھتا تھا، ایک معنی میں اس کا ذہن ایک ذخیرہ گاہ تھا۔ جب ضرورت ہوتی تھی وہ اس معلومات کو اسی ذخیرہ سے نکال کر کاغذ پر منتقل کردیتا تھا۔

یعنی آج سے بیس سال پہلے جیبی سائز کا کیلکولیٹر چند سو میں ملنے لگا تھا۔ اب یہ کارڈ سائز میں چالیس پچاس روپے میں مل جاتا ہے۔ یہ ساری ترقی الیکٹرانکس کی مرہونِ منت ہے۔

نعمان احمد: کمپیوٹر استعمال کرنے میں آپ کو سب سے زیادہ کس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تھا؟

مرزا صاحب: اس سلسلے میں شروع میں جو مسئلہ تھا وہ بیک اپ سروس کا تھا۔ یعنی جو چیز آپ خریدتے ہیں کیا اس کی بیک اپ سروس میسر ہوتی ہے۔ چیزیں تو سب مل جاتی ہیں لیکن بیک اپ سروس ہی نہ ہو تو سب بیکار ہے۔ اس کا مجھے شروع میں ہی تجربہ ہوگیا تھا۔ جب میں نے پہلا کلر اسکینر لیا تو پورے ملک میں اسے چلانے والا ایک شخص بھی نہیں تھا اور نہ ہی میرے ادارے کا کوئی فرد جاکر اس کی تربیت حاصل کرنے کو تیار تھا تو میں نے خود اس کی تربیت حاصل کی تھی۔ جرمنی جاکر، کوئی تین ہفتے کا کورس تھا اس میں دو ہفتے مشین چلانے کی تربیت تھی اور ایک ہفتہ ریفریش کا تھا۔ واپس آکر میں نے اپنے ایک دوست اللہ انہیں جنت نصیب کرے انہیں تربیت کے لیے جرمنی بھیجا تھا۔ وہ اسے درست کرنے کی تربیت لے کر آئے یعنی مشین ٹیکنیشن کی۔

ورنہ ہوتا یہ تھا کہ کوئی خرابی ہوگئی تو جرمنی سے مکینک آئے تو ٹھیک ہوگی۔ ان کا ایک سینٹر سنگاپور میں بھی تھا تو وہاں سے آدمی آتا تھا۔ یعنی ان کو آنے جانے کا خرچہ بھی دیں اور انتظار بھی کریں کہ مشین ٹھیک ہو تو کام شروع کیا جائے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کا انجینئر کسی اور ملک گیا ہوتا تھا اور کئی مہینے تک اس کے آنے کا امکان نہیں ہوتا تھا۔ تو میں نے بہتر سمجھا کہ اپنے ایک آدمی کو تربیت دلوادوں۔ تاکہ مشین کی سروس کے معاملے میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

نعمان احمد: انہوں نے آپ کے آدمی کو تربیت دینے کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں کیا؟

مرزا صاحب: نہیں بلکہ وہ خوش تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم آپ کے ملک میں اس کی تربیت نہیں دے سکتے آپ اپنا آدمی ہمارے پاس بھیج دیں۔ ہم اسے خوشی سے تربیت دیں گے۔ انہوں نے مشین کے بارے میں دو کورس رکھے تھے۔ ایک انجینئر کے لئے اور ایک آپریٹر کے لئے۔ میں ان سے آپریٹر کی تربیت حاصل کرکے آیا تھا اور محمد علی انجینئر کا کورس کرکے آئے تھے۔ جب نئی مشین آئی تو وہ جاکر اس کے بارے میں بھی سیکھ آئے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جب انہوں نے یہاں پر اپنی ایجنسی دی تو میں نے ہمیشہ ان سے یہی

شکایت کی کہ آپ اپنی ایجنسی کو دے دیتے ہیں اور یہ ہیں کہ نہ تو اپنے ہاں انجینئرز رکھتے ہیں اور نہ ہی بیک اپ سروس دیتے ہیں۔ اس سے کام نہیں چلتا ہے۔ اس پر انہوں نے ایجنسی دیتے ہوئے شرط لگادی کہ اپنے ہاں انجینئرز اور سروس رکھیں۔ اس سے مقامی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی کہ انہیں امیجنرز کے زیادہ ڈکلریشن ملنے لگے تھے۔ پہلے تو ایک ہی خریدار تھا۔ ایلیٹ، اس نے بیس برس میں تین کلر امیجنر خریدے تھے باقی سب تو سورہے تھے پھر ایک دم سے ہوا بدلی تو لوگوں نے دو چار دس بیس امیجنر لئے اور پھر تو ہر کمپنی نے لینے شروع کردیئے۔ پھر مختلف جاپانی اور جرمنی کمپنیوں نے یہاں پر اپنے دفاتر کھولے تھے اور انہوں نے ایسی مقامی کمپنیوں کو ترجیح دی تھی جو اس سلسلے میں انجینئرنگ سروس مہیا کررہی تھیں۔

کاشف زبیر: یہ تو ہوا امیجنر کا۔ اب کمپیوٹر کی طرف آتے ہیں؟

مرزا صاحب: جی کمپیوٹر کا بھی یہی حساب کتاب تھا۔ اس کی شروع میں کوئی بیک اپ سروس نہیں تھی۔ اس وقت بھی نہیں جب ہم نے ایلیٹ میں اسے متعارف کرایا تھا۔

نعمان احمد: آپ نے نئے دور کے گرافک سافٹ ویئر کب استعمال کرنا شروع کیے اور آپ کو ان میں کیا مسائل در پیش آئے؟

مرزا صاحب: خوش قسمتی سے ہمیں اپنے ڈیزائن کے لئے گرافک سافٹ ویئر اپنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی جب ہمیں اس کی ضرورت پیش آئی تو ہم نے چار پانچ لڑکے منگوائے اور ان میں سے جو بہتر تھا اسے رکھ لیا اس طرح ادارے کے افراد کو ان سافٹ ویئرز کے کورس کرائے۔ وہ اسے سیکھتے تھے اور بڑی خوشی سے یہ کام کرتے تھے حتیٰ کہ ہمارے بعض ٹائپسٹ حضرات نے بھی کمپیوٹر سیکھ کر گرافک ڈیزائن کا کام شروع کردیا۔

کاشف زبیر: آپ نے گرافک سافٹ ویئرز سے کب کام لینا شروع کیا تھا؟

مرزا صاحب: یوں تو ہم نے **1984**ء میں ہی کمپیوٹر استعمال کرنا شروع کردیا تھا لیکن یہ جو گرافک سافٹ ویئرز والے کمپیوٹر تھے۔ یہ **1990**ء کے عشرے کے آغاز میں آئے تھے۔ جب جدید قسم کے ملٹی میڈیا کمپیوٹر آنے لگے اور آپریٹنگ سسٹم بھی اس قابل ہوگئے تھے کہ گرافک سافٹ ویئر چلاسکیں۔ اب ہمارے کمپیوٹر ڈویژن میں جدید ترین پی سی کے ساتھ تمام جدید گرافک اور کام کے دوسرے سافٹ ویئرز موجود ہیں۔ ہم نے اپنے کمپیوٹر پر کام کرنے والے گرافک ڈیزائنرز کو فری ہینڈ دے رکھا ہے کہ وہ اپنے کام کے لئے کوئی سا بھی پروگرام منگوا سکتے ہیں اس طرح وہ اپنے ہارڈ ویئر کو بھی اپ گریڈ کرسکتے ہیں۔ اگرچہ اس کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے۔ کیوں کہ ہمارے جو صاحبزادے ہیں اویس انہیں کمپیوٹرز کا شوق ہے، وہ رسالے چھانتے رہتے ہیں اور نت نئی اشیا تلاش کرتے رہتے ہیں اور پھر انہیں اپنے کمپیوٹرز کے لئے منگواتے ہیں۔ ان کا ایک حلقۂ احباب ہے اسی شوق کا تو انہیں ان سے بھی جدید سافٹ ویئرز کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا ہے۔

نعمان احمد: آرٹ میں کمپیوٹر کی اس شمولیت کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیا اس نے آرٹسٹ کی جگہ لی ہے یا اس نے آرٹسٹ کی مدد کی ہے؟

مرزا صاحب: میں سمجھتا ہوں کہ آرٹسٹ سب سے پہلے اپنے دماغ میں فن کار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی انگلیاں، اس کے ہاتھ اوزار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اب وہ ہاتھوں سے برش استعمال کرے یا کمپیوٹر یا کوئی اور آلہ یہ سب اس کے لئے ٹولز ہیں۔ میرے نزدیک کوئی بھی شخص پیدائشی عنصر کے بغیر اپنے شعبے میں کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ بات اس کی طبیعات میں شامل ہونی چاہئے کہ اسے آرٹسٹ بننا ہے، گرافک ڈیزائنر بننا ہے یا ہاتھ سے کام کرنا ہے اور اس کو مشینوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ یہ سب الگ الگ چیزیں ہیں۔ مختلف اسٹیجز پر آدمی کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہمارے ہاں کام کرنے والے ٹائپسٹ سیکھ کر گرافک ڈیزائنر بن گئے۔ انہیں شوق ہوا کہ یہ تو ٹائپ رائٹر کی طرح کی شے ہے۔ انہوں نے اسے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا سیکھو کیونکہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ ایک شخص کے اندر کے فطری رجحان کو دبایا جائے بلکہ اسے کام کرنے کا موقع دینا چاہئے کیوں کہ آدمی میں جس کام کو کرنے کی صلاحیت ہوگی، وہ اسے بہتر طور پر کرسکے گا۔

کاشف زبیر: کمپیوٹر نے ایک فن کار کی کس حد تک مدد کی ہے؟

مرزا صاحب: میں نے کہا نا کہ بے حساب مدد کی ہے۔ آج سے چالیس سال پہلے ہم اپنے کام کے لئے صرف اسّی فیصد تکنیکی مدد لیا کرتے تھے۔ آج یہ مدد نوّے فیصد ہوگئی ہے۔ لیکن جہاں تک تعلق اس بات کا ہے کہ کمپیوٹر تخیل میں آدمی کی مدد کرنے لگا ہے وہ مرحلہ ابھی نہیں آیا

ہے بلکہ ابھی تک کمپیوٹر نے صرف دستی نوعیت کے کاموں میں انسان کی مدد کی ہے۔ یعنی جو کام پہلے ہم ہاتھ سے کرتے تھے۔ بڑی محنت اور وقت صرف کرتے تھے اب وہی کام بہت آسانی سے اور بہت کم وقت میں کمپیوٹر کی مدد سے ہوجاتا ہے۔ لیکن جہاں تک ڈیزائن سوچنے کا تعلق ہے تو پہلے بھی یہ کام انسانی دماغ کرتا تھا اور آج بھی انسانی دماغ ہی کرتا ہے۔ مشین وہی ہے لیکن کوئی آدمی ایک کام دو گھنٹے میں کرتا ہے تو دوسرا اس کام کو صرف دس منٹ میں کرلیتا ہے۔ یہ ہوتا ہے فرق۔ اس میں ایک بات اور ہے جو جتنا خود کو آج کے حالات کے مطابق رکھے گا وہ اتنا ہی کامیاب رہے گا۔

نعمان احمد: کمپیوٹر استعمال کرتے ہوئے آپ نے کبھی سوچا کہ اس میں اور کیا کیا چیزیں شامل کرنی چاہئیں؟

مرزا صاحب: یہ بڑا اہم سوال ہے۔ ایک آرٹسٹ کے طور پر زبانی بتانا میرے لئے مشکل ہے کہ اس میں کیا کیا چیزیں شامل ہونی چاہئیں۔ کمپیوٹر جاننے والا تو کہہ سکتا ہے کہ اس میں یہ اور یہ کمی ہے۔ ہاں میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس میں روز بروز ترقی ہی ہورہی ہے اور یہ بستر کی طرف جارہا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ میں کہوں کہ فلاں چیز اس میں شامل ہونی چاہئے یا یوں ہوجائے تو کسی کے پلے نہیں پڑے گا اور کوئی کرے گا بھی نہیں۔ دوسرے یہ کہ کمپیوٹر میں ریسرچ اتنی زیادہ ہوگئی ہے۔ اس میں اتنے سارے افراد کام کررہے ہیں کہ کسی نئی چیز یا خیال کی گنجائش نہیں ہے جو بھی خیال انسانی ذہن میں آرہا ہے اس پر کام جاری ہے انہیں سب معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے اور کس شعبے میں مزید کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

کاشف زبیر: نوری نستعلیق کے لئے کیا آپ نے کمپیوٹر کے انداز سے سوچا تھا؟

مرزا صاحب: میں اتنا بتادوں کہ میں کمپیوٹر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا یعنی اس کی بیسک Basic سے واقف نہیں ہوں۔ دوسرے میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا ہے کہ میں سافٹ ویئرز اور کمپیوٹر کے کام کرنے کے اصولوں کے بارے میں جانوں۔ میں نے اسے ایک آلے کے طور پر لیا ہے۔ میرے خیال میں باقاعدہ کمپیوٹر پر کام کرنا میری فیلڈ نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں نے از خود کچھ کرنے کے بجائے اپنے ادارے کے لوگوں کو بھیجا تھا کہ وہ جائیں اور اسے سیکھ کر آئیں۔ جہاں تک میری سوچ ہے تو میرے خیال میں کمپیوٹر پر کام کرنے کی آخری حد وہ آئے گی جب ایک آدمی سوچے گا اور کمپیوٹر وہ کام کردے گا۔ نئے آئیڈیاز اس طرح سامنے آئیں گے کہ میں سوچتا جاؤں اور کمپیوٹر اسے عملی شکل دیتا جائے نہ مجھے ہاتھ چلانے کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ منہ سے کچھ کہنے کی۔

کاشف زبیر: جیسا کہ آپ نے کہا کہ آپ کمپیوٹر کے بنیادی اصولوں سے واقف نہیں ہیں تو آپ نے یہ کب اور کیسے محسوس کیا کہ اب کمپیوٹر اس قابل ہوچکا ہے کہ اس سے اردو پبلشنگ کا کام لیا جاسکے؟

مرزا صاحب: اس زمانے میں لفظ کمپیوٹر سامنے نہیں آیا تھا۔ جب میں نے کلر اہکینر لیا تھا ہاں الیکٹرانکس ہوتی تھی اور اس کے کمالات ہم کلر سپریشن کی صورت میں دیکھتے تھے کہ کس طرح عکس تاروں کے ذریعے دوسری طرف پہنچ سکتا ہے۔ اس زمانے میں بھی مجھے الیکٹرانکس سے خاصی دلچسپی تھی جب میں باہر جاتا تھا تو خاص طور سے الیکٹرانکس کی اشیا کا معائنہ کرتا تھا۔ اس سے مجھے یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ دنیا کس طرف جارہی ہے ظاہر ہے میں ہر شے کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ جب میں نے دوسرا اہکینر لیا تو دنیا میں ڈیجیٹائز کا انقلاب برپا ہوچکا تھا۔

جہاں تک نوری نستعلیق کا تعلق ہے تو میں بتا چکا ہوں کہ میں سنگاپور گیا تھا۔ جہاں میں نے کمپیوٹر پر چینی زبان کی کمپوزنگ ہوتے دیکھی تھی۔ اگر آپ نے چینی دیکھی ہو تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ ایک بے حد مشکل اور پیچیدہ قسم کی زبان ہے جس میں سرے سے الفاظ یا حروف ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر شے یا لفظ کے لئے ایک نشان مقرر تھا اور انہوں نے اسے بھی کمپیوٹر پر منتقل کردیا تھا جب کہ اردو میں تو صرف سینتیس کریکٹر ہوتے ہیں' اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب اردو کی مشینی طباعت ممکن ہے اور مونو ٹائپ کارپوریشن کے تیار کردہ اس کمپیوٹر کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اسے ہم اردو طباعت کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ اس سے اردو کتابت کی جو بہت بڑی مصیبت ہے وہ دور ہوجائے گی اور خدا کے فضل سے ایسا ہی ہوا تھا۔ اس سلسلے میں میرا کام یہ تھا کہ لوگوں کو آمادہ کروں۔ میں مونو ٹائپ کارپوریشن والوں کو بتاؤں کہ یہ اردو زبان ہے اور میں اس کے لئے یہ کرنا چاہتا ہوں اور اس کے جتنے بھی انجینئرنگ کے اور الیکٹرانکس کے نقطے ہیں یہ وہ خود جانیں۔ اب اسے اتفاق کہیے کہ معجزہ۔۔۔انہوں نے اس چیز کو سمجھ لیا اور کر بھی دیا۔ اب اگر میں اس کی بیسک کے چکر میں پڑ جاتا تو یا خود اس کام کو کرنے کی کوشش کرتا تو شاید آج تک یہ کام نہ ہو پاتا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ عرض کروں کہ ایک صاحب میرے پاس آئے انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ انہوں نے پلیٹوں پر لگانے والے کیمیکلز یہاں بنانے میں اتنا وقت لگا دیا۔ میں نے کہا کیوں لگایا۔ کہنے لگے اگر جنگ ہوجاتی ہے تو باہر سے سب آنا بند ہوجائے گا اور یہ کیمیکلز نہیں ہوں گے تو پلیٹیں کیسے بنیں گی۔ میں نے اس سے کہا چلو ٹھیک ہے تم نے بنالیا لیکن یہ بتاؤ کہ کوئی فائدہ ہوا۔ کہنے لگا نہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے اسے بتایا چلو ٹھیک ہے تم نے پلیٹوں پر لگانے والا سلوشن تو بنالیا لیکن یہ پلیٹیں جن پر یہ سلوشن لگایا جاتا ہے یہ بھی تو باہر سے آتی ہیں جب جنگ ہوگی تو پلیٹیں بھی آنا بند ہوجائیں گی تو تم یہ سلوشن کن پلیٹوں پر لگاؤ گے۔ اس زمانے میں یہ زنک، تانبے اور المونیم کی پلیٹیں بھی باہر سے بن کر آتی تھیں۔ کہنے لگے...... بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، یہ پلیٹیں بھی بنالیں گے۔ حالاں کہ اس کے لئے طویل عرصہ بھی چاہئے تھا۔ پیسے کی فراوانی بھی اور تحقیق کرنے والے انسٹی ٹیوٹ بھی۔ اور میں تو اس چیز کا قائل ہوں کہ ہر آدمی ہر کام نہیں کرسکتا۔ اب اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ پہلے میں نے کمپیوٹر کی بیسک سمجھی اور پھر یہ کام کیا تو وہ غلطی پر ہے۔ اس زمانے میں ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کام کس زبان میں اور کس پروگرام کے تحت ہوا ہے تو میں نے ان کو جواب دیا ٹھہرنا ذرا میں مونو ٹائپ کارپوریشن والوں سے پوچھ کر بتاتا ہوں کیوں کہ یہ اس وقت انہوں نے مجھے بھی نہیں بتایا تھا کہ نوری نستعلیق کا سافٹ ویئر لکھنے کے لئے انہوں نے کون سی زبان استعمال کی تھی۔ ہر آدمی ہر کام بہر حال نہیں کرسکتا ہے۔

اس سلسلے میں ہنری فورڈ کا ایک واقعہ پیش کروں۔ اسے کسی نے کہا کہ تم تو بالکل جاہل ہو۔ اس سے کسی نے ادب کا سوال کردیا تھا اور وہ جواب نہیں دے سکا تھا۔ اس نے کہا دیکھو ایک ہال بک کرالیتے ہیں۔ ایک روز تم سب وہاں آجانا اور پھر مجھ سے جو سوال بھی کروگے میں اس کا جواب دوں گا۔ مخالفوں نے کہا یہ تو اچھا ہے۔ ہال کررہا ہے، اس کا خرچا برداشت کرے گا ری فریش بھی کرائے گا۔ لہٰذا مشکل سے مشکل سوال تیار کئے گئے۔ کسی نے انجینئرنگ کے بارے میں کسی نے کیمیا کے متعلق کسی نے ادب اور کسی نے زبان کے بارے میں سوال تیار کرلئے۔ بیس پچیس سوال جمع ہوگئے۔ وہ لوگ مطمئن تھے کہ ہنری فورڈ جواب نہیں دے سکے گا۔ جب وہ ہال میں پہنچے تو اسٹیج پر بیس کرسیاں رکھی تھیں اور ان پر ہر شعبے کا ماہر بیٹھا تھا۔ اس نے کہا سوال شروع کیجئے۔ سوال شروع کیے گئے۔ اسے معلوم تھا کہ اس شعبے کا ماہر یہ تھا اس نے اسے پکارا کہ جواب دو۔ ماہر نے اٹھ کر جواب دیا۔ اس طرح ایک ایک کرکے تمام سوالات کے تسلی بخش جواب مل گئے اور ہنری فورڈ کے مخالف ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ہنری فورڈ کی اصل قابلیت یہ تھی کہ اسے لوگوں سے کام لینا آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کون سا کام کس سے لینا مناسب ہے۔ اسے ہتھوڑا چلانا نہیں آتا تھا اور اس نے کار بنالی۔ اسے پیسہ بنانا نہیں آتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ پیسہ کس سے بنوانا ہے۔ فلاں کام کس سے لینا ہے تو میں بھی اسی چیز کا قائل ہوں کہ آدمی ہر کام خود نہیں کرسکتا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ فلاں کام کیسے کرنا ہے اور یہی میری قابلیت ہے۔

کاشف زبیر: یعنی آپ نے کمپیوٹر کی مبادیات کو نہیں سمجھا تھا بلکہ آپ نے دیکھا کہ اب کمپیوٹر یہ کام کرسکتا ہے۔

مرزا صاحب: بالکل میں نے ہمیشہ یہی کیا۔ میں نے کمپیوٹر کو چینی زبان کمپوز کرتے دیکھا اور مجھے اس سے یہ خیال آیا تھا۔

کاشف زبیر: دوبارہ ایلیٹ کی طرف آتے ہیں، اس ادارے کو چلانے میں شروع سے کون کون آپ کے ساتھ رہے اور اب کون سے حضرات اسے چلا رہے ہیں؟

مرزا صاحب: اچھا سوال ہے۔ ابتدا میں میرے ساتھ ایک چپراسی اور ایک پرنٹر تھا اور اس سے میں نے کام کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں جب پریس بڑھا، نئی مشینیں آئیں کام پھیلا تو اور لوگ بھی اس میں شامل ہوتے چلے گئے تھے۔ پریس مشین کے بعد میں نے ایک جاپانی کٹنگ مشین لی تھی، اس سے پہلے کاغذ باہر سے کٹواتے تھے۔ جس میں وقت اور پیسہ دونوں زیادہ لگتے تھے۔ پہلے جرمن پلیٹ بنا کر دیا کرتے تھے پھر میں نے پلیٹ میکنگ کا سامان بھی خرید لیا۔ شروع میں ہر ممکن کفایت سے کام لیا۔ مثلاً جاپانی کٹنگ مشین چوبیس انچ سائز کا کاغذ کاٹ سکتی تھی لیکن بہ وقتِ ضرورت ہم موڑ کر اس سے تیس اور چالیس انچ کا کاغذ بھی کاٹ لیا کرتے تھے۔ رقم کی بھی کمی تھی بلکہ شروع میں تو میرے پاس کاغذ اور سیاہی تک کے پیسے نہیں ہوا کرتے تھے، وہ بھی گاہکوں سے پیشگی لیتا تھا۔ خدا کا احسان ہے کہ مجھے شروع سے کام کی کمی نہیں رہی۔ اول تو میرا ارادہ ابا جان اور بھائی منظور کے کام کو چھاپنے کا تھا لیکن اس کے لئے بھی خاصی رقم چاہئے تھی۔

زین نورانی نے جو اس زمانے میں گرینڈ ایڈورٹائزر

کے ایم ڈی تھے، انہوں نے مجھے پاکستان ٹوبیکو کا کام دلوایا۔ میں نے ان کے لئے کئی ڈیزائن بنائے اور چھاپے بھی۔ انہوں نے مجھے پیشگی رقم دی۔ اس طرح جب مجھے لیور برادرز کا کام ملا تو میں نے ان سے بھی کاغذ اور اسپیشل سیاہی منگوائی تھی۔ کیوں کہ عام سیاہی کو صابن کی الکلی کھا جاتی تھی۔ حالاں کہ بیچ میں مومی کاغذ بھی ہوتا تھا اور پھر گتے کی پیکنگ بھی ہوتی تھی تو لکس ریپر کے لئے خاص طور سے الکلی کی مزاحمت کرنے والی سیاہی انگلینڈ سے منگوا کر دی گئی تھی۔

میرے برادران لا افتخار رسول 1957ء میں میرے پاس آ گئے۔ وہ بعد میں ایلیٹ کے منیجر بھی بنے تھے۔ امین نورانی جو میرے اچھے دوست تھے۔ انہوں نے ایلیٹ میں اکاؤنٹس کی بنیاد ڈالی تھی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تم جتنا اپنی اکاؤنٹنگ کو مضبوط رکھو گے تمہاری کمپنی اتنی ہی اچھی بنیادوں پر اٹھے گی۔ ادارے کی ترقی میں ان کا تعاون بھی شامل تھا۔ پھر منظور بھائی کام کر کے دیتے تھے لیکن وہ فری لانسر تھے۔ بعد میں منجھلے بھائی ظہور احمد بھی ایلیٹ میں آ گئے تھے۔ وہ 1958ء میں میرے پاس آئے تھے۔ ابا جان کی سرپرستی تو تھی ہی۔ حالاں کہ اس زمانے میں عرب نائن بلڈنگ والے پریس میں ان کے بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ آتے جاتے رہتے تھے اور وہاں ایک مختصر سی دوچھتی پر بیٹھ کر انہوں نے بے شمار ڈیزائن بنائے تھے ان میں سے بعض اب تک چھپ رہے ہیں۔

1958ء تک میں ایک ہی شفٹ میں کام کرتا تھا۔ لیکن کام کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ مجھے ناپسند ہونے کے باوجود دوسری شفٹ شروع کرنا پڑی تھی۔ اب لیبر کی سیاست شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے مشین مین نے مخالفت کی کہ صاحب مشین خراب ہوجائے گی اگر آپ نے دوسرے آدمی کو دی۔ میں نے کہا مشین ٹوٹے گی تو میری ٹوٹے گی اور اب تم چوبیس گھنٹے کام تو نہیں کر سکتے ہو اور مجھے کام کرانا ہے۔ بولا ٹھیک ہے صاحب آپ کی مرضی۔ اب اس نے حرکت یہ کی کہ ایک اسکرو ذرا ڈھیلا کر دیا۔ مین مشین چلتے چلتے رک جائے اور ٹوٹ جائے اگر اس روز نہ ٹوٹے تو اگلے روز دو پیچ ڈھیلے ہوگئے اور جب مشین ٹوٹ جاتی تو کہتا دیکھیے صاحب میں نہ کہتا تھا۔ جب وہ چلا جاتا تو میں دوسری شفٹ والے سے کہتا کہ ابھی سب روک دو پہلے اسکرو دیکھو اب وہ چیک کرتا اور بتاتا کہ صاحب فلاں اسکرو ڈھیلا ہے اور یہ چیز صحیح سے نہیں لگی ہے۔ یوں میں نے نئی شفٹ شروع کی۔ جب کام مزید بڑھا تو مجھے تیسری شفٹ بھی شروع کرنی پڑی تھی۔ کارکنوں نے جب دیکھا کہ میں چھوڑنے والا نہیں ہوں تو اسے قبول کر ہی لیا۔ پھر ہوتا یہ کہ سپروائزر سے لڑائی ہوئی اور نقصان مشین کا کرایا۔ ان دنوں ایک نئی مشین آئی تھی جس کا آئلنگ کا اپنا نظام تھا۔ ورنہ پہلی مشینوں میں کپی لے کر سوراخوں سے تیل ٹپکانا پڑتا تھا۔ نئی مشین میں انسانی جسم کی طرح رگیں پھیلی تھیں جو پوری مشین میں تیل لے جاتی تھیں۔ ایک مشین مین کی سپروائزر سے لڑائی ہوئی تو اس نے یہ کیا کہ تیل والا ڈبا کھولا اور اس میں جو تیل لے جانے والی نوزلز تھیں۔ اس میں سے چار کو بند کر دیا۔ اب گیئر میں صحیح طرح سے تیل نہیں گیا تو اس کی رفتار سست ہونے لگی۔ جب معلوم ہوا تو میں نے سب کو بلالیا اور ان میں سے ایک کے چہرے سے لگا کہ اس نے ہی گڑبڑ کی تھی۔ میں نے اسے اپنے دفتر میں بلالیا اور کہا۔ دیکھو مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ تم نے کیا ہے۔ پہلے تو وہ قسمیں کھانے لگا لیکن جب میں نے کہا کہ سچ کہنے پر میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس پر اس نے اقرار کرلیا کہ ہاں میں نے کیا تھا اور اس لئے کیا تھا۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا بعد میں اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے تو کسی نے کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے کیسے پکڑ لیا۔

اسی طرح ایک اور آدمی کی سپروائزر سے لڑائی ہوگئی تو اس نے مشین میں موبل آئل نکال کر السی کا تیل ڈال دیا جو ہمارے ہاں سیاہی میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ ذرا موٹا ہوتا ہے اور مزاحمت کرتا ہے۔ اب مشین کی رفتار جو چھ ہزار چکر فی منٹ تھی کم ہونے لگی۔ اگلے روز چار ہزار چکر پر آ گئی۔ اس سے اگلے روز یہ دو ہزار دو چکر رہ گئی۔ اب وہ لوگ میرے پاس آئے کہ مشین تو بالکل نہیں چل رہی ہے۔ میں نے جا کر دیکھا تو مشین سے السی کے تیل کی بو آ رہی تھی۔ آئل بکس کھولا تو اس میں موبائل کے بجائے السی کا تیل بھرا ہوا تھا۔ اب مشین چلے تو کیسے چلے۔ تو ایسی کتنی ہی حرکتیں مجھے برداشت کرنا پڑی تھیں۔ بڑا مشکل دور تھا اور اللہ تعالیٰ کی مدد ہو تب ہی آدمی اس دور سے گزر سکتا ہے۔ اب خدا کا شکر ہے یہ سب چیزیں کم رہ گئی ہیں ورنہ پہلے تو یہ معمول تھا کہ ایک شفٹ والے جاتے ہوئے مشین کی سیٹنگ آؤٹ کر جاتے تھے تاکہ دوسری شفٹ والے آئیں تو پہلے تو دو گھنٹے لگا کر مشین کی سیٹنگ درست کریں۔

کاشف زبیر: آپ کس لمحے یا واقعے کو ایلیٹ کے لئے ٹرننگ پوائنٹ قرار دیں گے؟

مرزا صاحب : ٹرننگ پوائنٹ تو کئی آئے تھے۔ ایک مشین سے دوسری مشین لی تو یہ بھی ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ پھر بڑی مشین لی۔ اس وقت لوگوں نے کہا اتنی مہنگی مشین لے لی ہے اس کی قیمت میں تو چار مشینیں آ جاتی ہیں۔ اس زمانے میں باہر سے ری کنڈیشن مشینیں بڑی آسانی سے اور کم قیمت پر مل جایا کرتی تھیں۔ میں نے کہا کہ نئی مشین میں جو بات ہوتی ہے وہ پرانی مشین میں نہیں ہوتی۔ لوگ بولے کہ پرانی مشینیں سستی بھی ہوتی ہیں اور ان پر ہمارے آدمی سیکھنے میں آسانی بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ جو نئی نئی مشینیں ہوتی ہیں ان میں نئی نئی باتیں شامل ہوتی ہیں جو ہمارے آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔

اس کے بعد جو اہم قدم اٹھایا، وہ پریس کی انڈسٹریل اسٹیٹ میں منتقلی تھی کیوں کہ عرب ٹائن بلڈنگ کے خاصے حصے کرائے پر لینے کے باوجود جگہ ناکافی پڑتی تھی اور مشینیں ٹھونس ٹھونس کر لگانی پڑتی تھیں۔ خود میں ایک دو چھتی میں قائم اپنے دفتر میں بیٹھا کرتا تھا۔ پہلے سولہ بائی بائیس کا ایک گودام تھا۔ اس کے بعد اندر کی طرف ایک اور گودام تھا بائیس ضرب ستائیس فٹ کا وہ لیا تھا۔ پھر دوسرا اس کے بعد تیسرا لیا۔ لیکن جس رفتار سے مشینیں اور آدمی بڑھ رہے تھے جگہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ تو میں نے سائٹ ایریا میں پلاٹ لے لیا۔ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ میں شہر میں ہی کوئی جگہ لوں گا کیوں کہ میرے سارے ہی گاہک یہیں تھے۔ میں نے سوچا نہیں انڈسٹریل اسٹیٹ ہی چلتے ہیں کھلی جگہ ہے اور سہولتیں بھی زیادہ ہوں گی۔ میں نے سوا دو ایکڑ کا جو پلاٹ لیا تھا اس کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہاں سے پہاڑی کا منظر نظر آتا تھا۔ جو نہایت بھلا لگتا تھا۔ اس وقت میرے پاس کوئی پچہتر آدمی تھے اور نائٹ شفٹ کا عملہ ملا کر سو کے قریب افراد ہو جاتے تھے۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور وہاں چلا گیا، یہ بھی ایک رسک تھا عین ممکن تھا کہ میرے گاہک اتنی دور آنا پسند نہ کرتے مگر ساتھ ہی اپنے کام پر اعتماد تھا۔ لوگوں کو معیاری کام کروانا ہے تو وہ میرے پاس اتنی دور بھی آ سکیں گے۔

سائٹ کی فیکٹری میں سب سے پہلے پچہتر فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ایک ہال بنوایا۔ ساری مشینیں اس میں سما گئی تھیں لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ وہاں فٹ بال کھیلو گے تو سچ مچ اتنی جگہ تھی کہ فٹبال کھیلی جا سکتی تھی۔ ہال ایک چھوٹے سے کونے میں تھا۔ اس کے بعد اتنا ہی بڑا ایک اور ہال بنوایا۔ جس میں پلیٹ میکنگ کی مشینیں لگائی گئی تھیں۔ تو پلیٹ میکنگ اور کلر سپریشن کا سارا کام اسی جگہ ہوتا تھا۔ یہیں میں نے پہلی بار دو کلر بیک وقت چھاپنے والی مشین لی۔ اس کے بعد چار کلر کی مشین لی تو واقعی یہ انقلابی قدم تھا۔ جب الیکٹرانکس کا دور آیا تو میں نے ایک ایسا قدم اٹھایا کہ سب نے کہا اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یعنی میں نے کلر اسکینر لے لیا۔ اب اسے چلائے گا کون۔ اگر خراب ہو گیا تو اسے دیکھے گا کون۔ لیکن اللہ کے فضل سے یہ چلا بھی اور اس کی مرمت بھی یہیں کر لی گئی۔ اسکینر میں نے خود چلانا سیکھا اور اس کی مرمت کی تربیت میرے ایک انجینئر دوست نے لی تھی۔

ایک بات کا میں نے ہمیشہ خیال رکھا کہ جہاں تک ہو سکے لوگوں کو روزگار کے مواقع ملنے چاہئیں۔ لہٰذا میں محنت بچانے والی مشینیں نہیں لگاتا تھا بلکہ ان کی جگہ پروڈکشن کی مشینیں لگاتا تھا۔ حالاں کہ بعد میں مجھے اس کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑا تھا۔ لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کا خیال کیسے آیا، اس کے پیچھے بھی ایک واقعہ ہے۔ جس زمانے میں مجھے آئی سی آئی کے لیبل چھاپنے کا کام ملا تھا۔ اس پر گولڈ کا پاؤڈر لگانا تھا۔ اندر لگانے سے یہ پاؤڈر اڑا کرتا تھا دوسری چیزیں خراب ہوتی تھیں اس وجہ سے میں یہ کام باہر سڑک پر کروارہا تھا۔ اس زمانے میں بھی یہ جگہ مین روڈ پر تھی لیکن ٹریفک بہت کم تھا بلکہ شام کو تو سڑک سنسان ہی ہو جایا کرتی تھی۔ میں کھڑا کام کروارہا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی ایک بچے کے ساتھ آیا۔ بڑے میاں کافی ضعیف اور بدحال لگ رہے تھے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس نے منع کیا۔ میں نے کہا پھر کیا چاہئے اور مجھے بڑا تعجب ہوا جب اس نے کہا کہ اسے کام چاہئے۔ مجھے صدمہ ہوا کہ یہ اس کے آرام کرنے کی عمر تھی اور وہ کام مانگ رہا تھا۔ اس نے مجھے متاثر بھی کیا تھا۔ میں نے پوچھا اور یہ بچہ کیا کرے گا۔ کہنے لگا میرے ساتھ بیٹھا رہے گا۔ میں نے اسے بھی کام کرنے والوں میں شامل کر لیا۔ شام کو جب کام ختم ہوا تو سب سے پہلے اس کے پیسے دیئے بلکہ روز کے روز اس کی اُجرت دے دیا کرتا تھا۔ ہر شام جاتے ہوئے وہ میرا شکریہ ادا کیا کرتا تھا۔ اس واقعے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہر آدمی کو کام کرنے کا موقع ملے اور برابر کا ملے۔ تو جتنے بھی لوگ میرے پاس کام کے لئے آتے تھے، میں ان سب کو کہیں نہ کہیں لگا دیتا تھا۔ ایک کی جگہ دو، تین، چار غرض کہ جتنے بھی آتے میں لگا دیتا۔ ایک زمانے میں میرے پاس پانچ سو سے زیادہ کارکن ہو گئے تھے۔ بعد میں ان میں کچھ

خطرناک لوگ بھی گھس آئے تھے۔ وہ کام کے بجائے سازشیں کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ تو بڑا احمق آدمی ہے کام بھی نہیں لیتا۔ بس کہتا ہے بیٹھ جاؤ کچھ نہ کچھ کرتے رہو۔ پھر لیبر یونین کا چکر چلا۔ اس وقت میرے پاس کوئی تین سو آدمی تھے۔ اور باہر کے جو لیبر لیڈر تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی کمپنیوں کو بلا کر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے ہمارے آدمیوں کو بھی ملا کر یونین بنائی اور کال دے دی کہ ہم ہڑتال کریں گے۔ میں نے ان سے کہا نہ میری آئل کمپنی ہے۔ نہ ہی دواؤں کی کمپنی ہے ایک چھوٹا سا پریس ہے کسی اور سے مقابلہ کرنے کے بجائے پریس انڈسٹری میں مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ اگر کوئی اس سے دس فیصد بھی کم دے رہا ہے جتنی تنخواہیں میں دیتا ہوں تو میں دس فیصد اور بڑھا دوں گا۔ تو وہ کوئی جواب نہیں لا سکے کیوں کہ ایسا کوئی تھا نہیں۔ لہٰذا وہ مطالبے کرتے رہے۔ یہ چاہئے وہ چاہئے تنخواہیں بڑھاؤ۔ بونس دو، اوور ٹائم اتنا ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے میں نے نہیں مانی ان کی بات اور یونین کی پوری مینجنگ کمیٹی کی چھٹی کر دی۔ 1972ء کے شروع میں جب قوم ''آزاد'' ہوئی تھی کیوں کہ بڑے صاحب نے کہہ دیا تھا یہ سب تمہارا ہے لے لو۔ تو نئی آنے والی جو کمیٹی تھی اس نے پھر یونین بنا لی۔ یہ پیپلز پارٹی کے لوگ تھے۔ ایک دن میں فیکٹری کی کار پورچ میں کھڑا تھا کہ ایک آدمی سلک کا کرتہ پہنے بڑا اکڑتا ہوا سامنے سے گزرا۔ مینجر نے بتایا کہ یونین کا نیا صدر ہے۔ وہ مکرانی تھا کوئی اور صدر بن کر اس میں ہوا بھر گئی تھی۔ ایلیٹ میں رمضان میں ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ دی جاتی تھی جو پھر باقی گیارہ مہینوں میں کٹا کرتی تھی۔ یہ دوسری تنخواہ پندرہ رمضان کو دی جاتی تھی۔ تو چھیڑ خانی کے لئے انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں یہ تنخواہ پہلی تاریخ کو دے دی جائے۔ میں نے ان سے کہا دیکھو یہ ہے ایگری منٹ میں اس کے حساب سے چلوں گا اور کچھ نہیں کروں گا اگر اس میں تم پندرہ کے بجائے پہلی لکھوا لیتے تو میں پہلی کو دے دیتا۔ وہ کہنے لگے نہیں صاحب ہم تو ہڑتال کریں گے۔ میں نے کہا کرو۔ اگلے روز میں نے مینجر سے پوچھا کہ کتنے لوگ گئے ہیں ہڑتال پر، کہنے لگا۔ چالیس پچاس گئے ہیں۔ ڈیڑھ سو پونے دو سو افراد کام کر رہے ہیں۔ اسی وقت میں نے محمد علی سوسائٹی میں دفتر لے لیا تھا۔ میں نے کہا پہلی جیت تو یہ ہوئی کہ صرف بیس فیصد لوگ ہڑتال پر گئے ہیں۔ اب بس اسٹاپ پر کہلوا دو کہ فیکٹری میں کام ہو رہا ہے ورنہ یہ لوگوں کو گمراہ کریں گے کہ فیکٹری بند پڑی ہے۔ اس زمانے میں دفتر سے لے کر سائٹ کی فیکٹری تک بس چلا کرتی تھی۔ اس سے اگلے دن میں نے کہا کہ جو لوگ ہڑتال سے واپس نہیں آئے ان کی چارج شیٹ تیار کرو۔ مینجنگ کمیٹی کو چارج شیٹ ملی تو بڑی اودھم مچی تھی۔ اس وقت پیپلز پارٹی کے مقامی دفاتر میں فیکٹریز کے مالکان اور مینجروں کو بلا کر خاصا ذلیل کیا جاتا تھا۔ بعضوں کے تو کپڑے اتروا لئے جاتے تھے اور تشدد بھی کیا جاتا تھا مجھے بھی لیبر ڈیپارٹمنٹ سے فون آ گیا کہ بھئی جمیل یہ کیا کیا تم نے۔ ان سب کو نکال دیا۔ میں نے ان سے کہا۔ جناب یہ رکھی ہیں فیکٹری کی چابیاں۔ آپ آیئے اور فیکٹری چلایئے۔ میرا تو شوقیہ کام ہے اب یہ دردِ سر ہو گیا ہے تو میں تو اسے نہیں کرتا اور میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو آپ مجھے بند کر دیجیے۔ اس زمانے میں یہ بہت آسان تھا۔ خاصے شرفا حوالات کی سیر کر آئے تھے (قہقہہ) اور بھی فون آئے، دھمکیاں ملیں۔ میں نے ان سے بھی کہا کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ صرف مینجنگ کمیٹی کو ملازمت سے نکالا ہے اور کسی کو نہیں نکالا۔ عام کارکنوں کے لئے میں نے کہہ دیا کہ یہ ڈیڈ لائن ہے اس وقت جو بھی آ گیا، میں اسے واپس لے لوں گا تو سوائے پانچ چھ کے سبھی واپس آ گئے تھے۔

ہمارے ہاں جو محنت کے قوانین ہیں وہ امریکا میں بھی رائج نہیں ہیں۔ حالاں کہ ہماری انڈسٹری گندم کا ایک دانہ ہے تو ان کی انڈسٹری پورا غلے کا گودام ہے۔ اس سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ قوم کو یہ تو بتا دیا گیا کہ یہ تمہارے حقوق ہیں انہیں حاصل کر لو، یہ کسی نے نہیں بتایا کہ کچھ فرائض بھی ہوتے ہیں۔ حالاں کہ دونوں کی وضاحت کی جانی چاہئے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ صرف لاؤ لاؤ کرتے رہے اور اپنا فرض کسی نے ادا نہیں کیا تھا۔ اس وقت تک میرے پاس تین شفٹوں میں کوئی پانچ سو افراد کام کرتے تھے جب وہ دردِ سر بنے تو میں نے ان کی طاقت کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1990ء تک میں ان کی تعداد تین سو کر دی تھی۔ اس کے بعد اور بھی کم ہوتے۔ اب شاید ڈیڑھ سو افراد کام کرتے ہیں۔ ورنہ تو میرا نظریہ تھا کہ سبھی کو ملازمتیں دو۔ وہ مشین ہرگز نہ لگاؤ جو آدمی کے بجائے کام کرتی ہے کیوں کہ اس سے روزگار پر اثر پڑے گا تو ان لوگوں نے خود ہی میرا دماغ درست کر دیا۔

کاشف زبیر: یعنی آپ کے خیال میں ہمارے ہاں جو لیبر لاز ہیں وہ نامناسب ہیں؟

مرزا صاحب: کسی حد تک۔ دیکھیے پرنٹنگ انڈسٹری

میں بونس سب سے پہلے میں نے دیا تھا۔ پراویڈنٹ فنڈ کا تصور میں نے دیا۔ اس وقت تو کوئی بونس بھی نہیں دیتا تھا۔ میں نے ڈبل اوورٹائم دیا جب کہ پریس میں سرے سے اوورٹائم کا تصور نہیں تھا۔ ٹیکس میں نے ہمیشہ پورے دیئے۔ اس زمانے میں میرا انکم ٹیکس ایک لاکھ روپے تھا تو انکم ٹیکس آفیسر خود مجھ سے ملنے آیا تھا کہ یہ کون آدمی ہے جو اتنا بڑا ٹیکس دے رہا ہے جب کہ اس زمانے میں کروڑ پتی بھی اتنی رقم کا ٹیکس نہیں دیتے تھے۔ ایک لاکھ تو آج کے ایک کروڑ کے برابر ہی سمجھیے۔

ایلیٹ میں شروع میں مینجنگ میں خود کرتا تھا۔ اس کے بعد ایک منیجر رکھ لیا تھا۔ **1957**ء میں افتخار رسول میرے ساتھ آئے۔ جنہوں نے انتظامیہ سنبھال لی تھی۔ پھر میرے ایک چچازاد بھائی بشیر احمد بھی ایلیٹ میں آ گئے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کو اس غرض سے کبھی فیکٹری میں نہیں آنے دیا کہ وہ کوئی کام دیکھیں یا کام سیکھیں۔ میں چاہتا تھا کہ جب تک ان کی تعلیم نہ مکمل ہو جائے اور جب تک وہ خود فیصلہ نہ کر لیں کہ انہوں نے کس شعبے میں کام کرنا ہے وہ فیکٹری نہ آئیں۔ میں انہیں کہتا تھا کہ ایک پڑھا لکھا آدمی ایک ان پڑھ اور غیر تربیت یافتہ آدمی کی نسبت کہیں بہتر کام کر سکتا ہے۔ نئے سیکھ کر آنے والے نئی سوچ رکھتے ہیں اور وہ ترقی کے انوکھے انداز اختیار کرتے ہیں۔ میں مثال دیتا ہوں۔ میں اپنی کھڑکی کے آگے ایک پودا لگاتا ہوں۔ جو خوشنما لگتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد وہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ہوا روشنی سب روک دیتا ہے۔ اب مجھے اس سے جذباتی وابستگی ہو گئی ہے اس لئے میں اسے نہیں کٹواتا ہوں۔ اب دوسرا آدمی آتا ہے تو وہ کہتا ہے کیا بیکار پودا ہے نہ روشنی آنے دیتا ہے نہ ہوا۔ اسے کاٹو نکالو یہاں سے۔ اس طرح آدمی ہو یا کوئی اور شے نیا آنے والا اسے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھے گا۔ جذبات کے لحاظ سے نہیں۔

میرے بڑے صاحبزادے **1972**ء میں امریکا سے تعلیم مکمل کر کے آئے۔ **1974**ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ خالد احمد نے اسی برس ایلیٹ کو جوائن کر لیا تھا۔ سب سے چھوٹے اویس **1983**ء میں امریکا سے تعلیم حاصل کر کے آئے۔ اچھا ان سے جو بڑے تھے۔ جب وہ واشنگٹن کی سیاٹل یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے تو ان کی ملاقات ایک جاپانی لڑکی سے ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ان سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اسلام بھی قبول کرنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا کراچی آؤ۔ تو وہ یہاں چلی آئی۔ اس نے اسلام قبول کیا اور پھر یہیں شادی ہوئی۔ اس کے بعد وہ جاپان چلے گئے۔ جاپان میں ہی ان کے تین بچے ہوئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب بچوں کو پاکستان لانا چاہئے۔ ویسے تو وہ سال میں ایک بار آتے ہی تھے لیکن پھر وہ مستقل چلے آئے۔ بدقسمتی سے یہ کراچی کی سیاست کا بدترین دور تھا۔ یعنی **1984**ء سے **1988**ء تک۔ اب وہ خود تو ٹی وی اخبار نہیں دیکھا کرتی تھیں لیکن ان کے والدین جو جاپان میں تھے وہ یہاں کے حالات کے بارے میں جانتے رہتے تھے اور پریشان رہا کرتے تھے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ ورنہ تمہارے ماں باپ پریشان ہوتے رہیں گے۔ تو وہ واپس چلے گئے۔ اب وہ امریکا میں ہوتے ہیں لیکن خالد اور اویس میرے ساتھ ہی رہے اور اب ایلیٹ کو یہ دونوں ہی چلا رہے ہیں۔ **1972**ء میں، میں نے اپنا دفتر محمد علی سوسائٹی میں منتقل کر لیا۔ اس کی ایک وجہ تھی۔ ایک صاحب مجھ سے ملنے سائٹ کے علاقے میں آئے۔ اس وقت ناظم آباد کا ماحول بڑا عجیب تھا۔ لوگ گروہ کی صورت میں ڈنڈے لے کر گاڑیوں کو روک لیتے تھے۔ ڈنڈوں سے گاڑیوں کو بجاتے اور گالیاں وغیرہ دیا کرتے تھے۔ یہ صاحب جو ملنے آئے دل کے مریض تھے اور نازک آدمی تھے۔ ان کا ڈرائیور بھی ضعیف آدمی تھا۔ جب مجمع نے گھیرا تو ڈرائیور کے ہاتھ پیر بھی کانپنے لگے تھے۔ ان صاحب نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ بھئی گاڑی روک لو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تو لوگ آئے ڈنڈے سے گاڑی بجاتے رہے گالیاں بھی دیں۔ لیکن اور کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور چلے گئے اس پر ان کی جان میں جان آئی۔ وہاں سے نکلے اور اپنے دفتر آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے فون کیا اور بولے جمیل آج اگر میں مرجاتا تو اس کے ذمے دار تم ہوتے۔ تم سے ملنے آیا تھا اور میرے ساتھ یہ ہوا۔ آئندہ نہیں آؤں گا۔ میں نے ان سے ہمدردی کی اور کہا یہ تو بہت ہی خراب بات ہے۔

ابھی میں نے ان سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا کہ یہی واقعہ میرے ساتھ پیش آ گیا۔ ان دنوں میرے پاس ایک امریکن گاڑی تھی ڈیسٹو ڈپلومیٹ، یہ بہت بڑی گاڑی تھی۔ میں نے **1960**ء میں اسے خریدا تھا اور اس پر میں نے پورے ملک کی سیر کی تھی۔ شروع میں گاڑی خود چلاتا تھا۔ پھر ڈرائیور لے لیا تھا لیکن اس روز گاڑی میں خود ہی چلا رہا تھا جب لوگوں نے مجھے روک لیا۔ کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا کسی کے ہاتھ میں کھلا چاقو۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں ڈر

جا تا اور وہیں گاڑی روک لیتا۔ لیکن اپنا مغل خون گرم تھا۔
میں چلتا رہا آہستہ رفتار سے۔ اسّی میل کی رفتار تھی گاڑی روکی نہیں۔ وہ خود ہی بچنے کے لئے دائیں بائیں بھاگے اور میں وہاں سے نکل آیا۔ میں نے کہا آج یہ دیکھ لیں کہ گاڑی کون سی ہے آئندہ اس کے سامنے نہ آئیں۔ وہ تو گھر آ کر اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اگر کسی کی چپل ہی اٹک جاتی یا کسی کا پیر ٹائر تلے آ جاتا تو میرا بچنا محال تھا کیوں کہ اتنا بڑا مجمع تھا اور ان کے پاس اتنی چیزیں تھیں حملہ کرنے کے لئے۔

اس کے بعد میں نے اپنا دفتر محمد علی سوسائٹی میں منتقل کرلیا تھا۔ یہی دفتر ہے۔ جہاں نوری نستعلیق وجود میں آئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ قریب ہی سید صاحب رہتے تھے۔ سید مطلوب الحسن، دو تین گلیوں کی دوری تھی اور ہم پیدل ہی ایک دوسرے کے پاس چلے آیا کرتے تھے اور مجھے فرصت ملی کہ میں اردو کے بارے میں سوچوں کیوں کہ میری بھی اور سید صاحب کی بھی خواہش تھی کہ اردو کے لئے کچھ کیا جائے اور اس زبان کو کسی طرح مشین پر لایا جائے۔ اب شام کو میں ان کے گھر چلا جاتا یا وہ میرے دفتر آ جایا کرتے تھے اور ہم گھنٹوں اس بارے میں بحث کیا کرتے تھے۔ اب اس وقت ہم کمپیوٹر کے بارے میں تو نہیں جانتے تھے لیکن اردو کمپوزنگ کو قائم کرنے کے بارے سوچا کرتے تھے۔

کاشف زبیر: پریس انڈسٹری میں مقابلے کی کیا صورتِ حال ہے؟

مرزا صاحب: مارکیٹ میں پرنٹر کا آپس میں مقابلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ پرنٹنگ ایک ایسی صنعت ہے کہ اس میں آدمی ایک چھوٹی سی مشین لے کر اور ایک کونے میں بیٹھ کر بڑی سے بڑی کمپنی کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے اخراجات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی پرنٹر ہے اور خود ہی جا کے کام بھی لے آتا ہے اور خود اسے کر بھی لیتا ہے۔ جیسا کہ ایک زمانے میں، میں نے کیا تھا کہ ایک مشین سے آغاز کیا تھا اور سارے ہی کام خود کیا کرتا تھا۔ اس وقت آئی سی آئی کا چیئرمین کام کے لئے میرے پاس آتا تھا۔ اس کے بعد وہ منیجرز کے پاس جانے لگا اور اب کام کے لئے آنے والے کلرک سے ملتے ہیں۔ اس سے ایسا ہوا ہے کہ کرپشن بڑھی۔ اب جو چھوٹے پرنٹر ہیں انہیں ان مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا کیوں کہ وہ کسی پر انحصار کرنے کے بجائے سب ہی کچھ خود کرتے ہیں۔ وہ خود پرچیز کرتے ہیں جب کہ بڑے اداروں میں پرچیزنگ کا افسر ہوتا ہے اور وہ عام طور سے گھپلے کرتا ہے۔ مگر چھوٹے پرنٹر صرف ایک حد تک ہی ترقی کرسکتے ہیں۔ صرف اپنے اوپر انحصار کرکے آدمی کسی اونچے مقام تک نہیں آ سکتا۔ اگر میں خود ہی مشین چلاتا تو آج شاید اسی سولہ بائی بائیس کے گودام میں بیٹھا ہوتا۔ اسی طرح بڑے اداروں کو جو بڑے پیمانے پر کام کرکے کاسٹ کم کرنے کے فوائد ہیں وہ ان چھوٹے پرنٹرز کو حاصل نہیں ہوتے۔

پہلے لیبر لاز صرف بڑے اداروں پر لگتے تھے لیکن اب یہ چھوٹے اداروں پر بھی ہونے لگے ہیں۔ اس سے بھی اخراجات میں بڑا فرق آیا ہے۔ حال میں ہمیں سب سے زیادہ نقصان جنرل سیلز ٹیکس کے نفاذ نے پہنچایا ہے۔ جہاں تک ایلیٹ کے معیار کا تعلق ہے تو یہ پاکستان میں پہلی پبلشنگ کمپنی ہے جس نے آئی ایس او 9000 کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے۔ یہ ہمیں کوئی ڈھائی برس پہلے ملا تھا۔ جب میرے دوست امین نورانی نے کمپنی کا سسٹم ترتیب دیا تو انہوں نے ہر شے کے لئے ایک طریقۂ کار طے کردیا تھا کہ چیزیں کیسے آئیں گی۔ ان کی انٹری کیسے ہوگی۔ کتنی خرچ ہوئیں اور کتنی باقی ہیں۔ بل کتنا بنا غرض کہ ایلیٹ میں ہمیشہ مکمل حساب کتاب رکھا گیا۔ اسی وجہ سے ہماری کمپنی کو باقاعدہ سرٹیفائیڈ کیا گیا۔ یہ ٹیکس ادا کرتی رہی ہے اور اب جی ایس ٹی بھی ادا کررہی ہے۔ انکم ٹیکس کا میں بتا چکا ہوں کہ آج سے کوئی چالیس سال پہلے میں نے سال میں ایک لاکھ کا انکم ٹیکس دیا تھا۔

یعنی ایلیٹ میں سارا کام حساب کتاب سے ہوتا ہے۔ اب یہ جو چھوٹی کمپنیاں ہیں یہ باقاعدہ حساب کتاب تو رکھتی نہیں ہیں لہٰذا یہ جی ایس ٹی مار جاتی ہیں اب اس سے ان کی کاسٹ پندرہ فیصد کم ہوجاتی ہے۔ لہٰذا یہ بزنس کا بڑا حصہ لے جا رہی ہیں... بلکہ اب تو ایسا ہے کہ سرے سے کمپنی ہی رجسٹر نہیں ہے۔ آج ایک لیٹر ہیڈ چھپایا۔ اس سے آرڈر لیا۔ کام کیا اگلے دن دوسرے لیٹر پیڈ کی مدد سے کام کرنے لگے۔ اس قسم کی بے نام اور بے نشان کمپنیوں کا آرگنائز کمپنیوں پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ جو سرکار کو ٹیکس ادا کرتی ہیں، وہ مجبور ہیں کہ گاہک سے جی ایس ٹی والی قیمت وصول کریں۔ اب گاہک تو یہ دیکھتا ہے کہ فلاں کمپنی سے کام کرانے کی صورت میں اس کا بل کم بن رہا ہے۔ اسے کوئی غرض نہیں کہ وہ کمپنی جی ایس ٹی ادا کررہی ہے یا نہیں۔ بعض گاہک تو صاف کہتے ہیں صاحب ہم جی ایس ٹی کیوں

دیکھیں ہم تو بل دیکھیں گے۔ تین برس پہلے ایک سالانہ رپورٹ میں میں نے لکھا تھا کہ اس کا بہت خراب اثر پڑ رہا ہے۔ آرگنائز کمپنیوں پر بھی اور سرکاری ریونیو پر بھی۔ ٹیکس چوری کی صورت میں اور حکومت کو اس معاملے میں کچھ کرنا چاہئے۔ نان آرگنائز کمپنیوں نے کروڑوں کا ٹیکس چوری کرلیا ہے کیوں کہ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

ایلیٹ کی مینجمنٹ ابتدا سے میرے اوپر انحصار کررہی تھی اور ظاہر ہے مجھے اس کام کی کوئی تربیت نہیں تھی۔ بس سنہا صاحب اور مودی آرٹ کے زمانے میں جو سیکھا تھا اسے ہی کام میں لارہا تھا۔ بعد میں افتخار رسول آئے جو منیجر بنے۔ لیکن اس سے بھی کام نہیں چلا تھا۔ میں نے جو پودے والی مثال دی تھی جو ہوا اور روشنی روک دیتا ہے، پرانا آدمی اسے نہیں کٹوا تا لیکن نیا آدمی اسے بے دریغ کٹوا دیتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ آدمیوں کا ہے۔ چالیس سال پہلے میں نے جو منیجر رکھا تھا وہ دو چار شعبوں کے پچیس تیس آدمیوں کو سنبھال سکتا تھا لیکن جب شعبے بڑھے اور آدمی بھی سو ڈیڑھ سو ہو گئے تو انہیں سنبھالنا اب پرانے منیجر کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ میں اسے نکال نہیں سکتا تھا لیکن جو نیا آدمی آئے گا وہ یہ سب نہیں دیکھے گا۔ وہ کہے گا یہ آدمی اس پوزیشن کے قابل نہیں ہے۔ اس کی چھٹی کرو تو میرے بڑے صاحب زادے خالد جب امریکا سے تعلیم مکمل کر کے آئے اور انہوں نے منیجمنٹ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی تکنیکی تربیت بالکل نہیں تھی۔ اس سلسلے میں میرا نظریہ ہے کہ تکنیکی کام آدمی بہت جلد سیکھ جاتا ہے لیکن جہاں تک مینجمنٹ کا تعلق ہے یہ خاصا مشکل کام ہے۔ ایک عام فرد کسی چھوٹی سی کمپنی کو چلا سکتا ہے لیکن جب معاملہ کسی بڑے ادارے کا ہو تو تربیت یافتہ مینجمنٹ لازمی ہے۔ جیسے میں نے شروع میں کام چلا لیا تھا لیکن جب کمپنی بڑی ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اب اسے باقاعدہ مینجمنٹ کی ضرورت ہے۔ خالد اس شعبے کی تربیت لے کر آئے تھے۔ ہمارا ایک شعبہ ہے بلکہ ایک اور فرم ہے النور انٹرنیشنل تو اس کا چارج میں نے ان کو دے دیا کہ اسے اب تم چلاؤ اپنی مرضی سے۔ اس جگہ کام کر کے انہوں نے تکنیکی اشیا بھی سیکھی تھیں۔ خالد نے امریکا جانے سے پہلے کراچی یونیورسٹی سے شماریات میں ایم۔ اے کیا تھا اور اس میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ امریکا میں انہوں نے تین سال گزارے۔ واپس آ کر انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے النور کو چلایا پھر ان کی ایلیٹ میں ضرورت پڑی کیونکہ ادارہ بزنس کے لحاظ سے بڑھ رہا تھا تو انہیں ادارے میں ڈائریکٹر کے طور پر اپائنٹ کرلیا گیا تھا۔ ان سے چھوٹے صاحب زادے اویس بھی امریکا سے مینجمنٹ اور کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرکے آئے۔ انہوں نے شروع سے ہی ادارے میں کمپیوٹر رائج کرنے کی کوشش کی۔ ابتدا میں تو انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن پھر انہوں نے پہلے اکاؤنٹنگ اور پھر دوسرے کئی شعبوں میں کمپیوٹر رائج کردیا تھا۔ اس سے ادارے کے حساب کتاب کے نظام میں حیرت انگیز بہتری آئی تھی۔ ورنہ پہلے سارا کام ہاتھ سے ہوتا تھا۔ بہت ہوا تو ایک ٹائپ رائٹر جتنا بڑا کیلکیولیٹر استعمال کرلیا۔ رپورٹ تیار کر کے ٹائپسٹ کو دی اور اس نے دس غلطیاں کیں۔ ان کی تصحیح کی گئی۔ رپورٹ دوبارہ تیار کی جاتی اور اس میں پھر غلطیاں نکل آتی تھیں۔ اب کمپیوٹر پر ہی رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔ اس پر اس کی تصحیح کرلی جاتی ہے اور ضرورت پڑے تو پرنٹر سے اس کا پرنٹ بھی نکال لیا۔ نہ ٹائپ کا چکر اور نہ ہی بار بار ہونے والی غلطیاں کیونکہ ایک بٹن دبا کر غلطی بھی درست کی جاسکتی ہے۔ اس سے بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ اب ہمارا اکاؤنٹ سیکشن، پرچیز اور پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ ہیں۔

کاشف زبیر: ایلیٹ کے اہم کاموں کے بارے میں بتایئے؟

مرزا صاحب: ایلیٹ کی خوش قسمتی کہ اسے شروع سے اہم نوعیت کے گاہک ملے تھے۔ سب سے پہلے پاکستان ٹوبیکو کمپنی کا کام ملا۔ ان کے ایجنٹ گرانٹ ایڈورٹائزر تھے۔ میں نے انہیں جو ڈیزائن بنا کر دیئے، وہ انہیں پسند آئے تھے۔ اس پر انہوں نے ڈیزائن کی پرنٹنگ بھی کرنے کو دی۔ مجھے اس کا بہت اچھا معاوضہ ملا تھا۔ اس کے بعد آئی سی آئی کا کلینڈر چھپنے کو ملا پچاس ہزار کی تعداد میں۔ یہ اس زمانے میں بہت بڑا آرڈر تھا پھر لیور برادرز کے لکس ریپر کا کام ملا۔ اس کے بعد گلیکسو والے آ گئے۔ ڈینسو نامی ایک کمپنی تھی۔ ڈاکٹر نور بھائی اس کے پرچیزنگ آفیسر یا منیجر تھے۔ وہ خود مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے اور کام دیا تھا۔ میں نے ہمیشہ منفرد نوعیت کے کام کرنے کی کوشش کی۔ جیسے لیور برادرز کا ایک ریپر تھا جسے لینے سے ہر پرنٹر نے انکار کردیا کیونکہ اس کا جو ڈیزائن تھا اور اس میں جو کلر سپریشن تھی، وہ کوئی اور کر نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اسٹیپز کے طریقے پر بنائے ہوئے اس ڈیزائن میں کوئی پانچ کلر استعمال ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایسا ہی ڈیزائن بمبئی میں اباجان نے بنا کر دیا تھا لیکن اس کی کلر سپریشن لندن سے ہو کر آئی تھی۔ انہوں نے

ڈیزائن دیکھا تو بولے پہلے بھی بنا چکا ہوں لاؤ پھر بنا دوں۔ اس کام پر لیور برادرز والے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے نہ صرف مجھے پیشگی پیسے دیئے بلکہ اس کے لیے باہر سے خصوصی سیاہی اور کاغذ بھی منگوا کر دیے تھے۔ میں نے اسے بے شمار تعداد میں چھاپا اور میں نے دو مشینیں صرف اس کے لیے مخصوص کر دی تھیں۔ اس طرح کوہ نور کیمیکلز کے بے شمار کام ایلیٹ نے کر کے دیئے۔ خاص طور سے ان کا تبت سنو کا ڈیزائن اور اس کی پرنٹنگ ایسا کام ہے جو ہمارے ہاں شاذ ہی کسی نے کیا ہو۔ اس کے علاوہ پریمیئر ٹوبیکو کمپنی کے کام کیے انہوں نے صمد اسپیشل کے نام سے ایک برانڈ نکالا۔ وہ میں نے چھاپا پھر کے ٹو چھپنے آیا۔ اسے سوئٹزرلینڈ میں بنوایا گیا تھا اور چھپنے کے لیے ہمارے ہاں آیا تھا لیکن اس پر خاصا کاغذ ضائع ہو جاتا تھا تو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ ڈیزائن میں ذرا سی تبدیلی کر لیں تو تمہارا اچھا خاصا کاغذ بچ جائے گا۔ اس پر صمد صاحب نے کہا بنا کر دو۔ میں نے انہیں بنا کر دیا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ ڈیزائن پہلے سے بھی اچھا ہو گیا۔ میں نے کیا یہ کہ اس پہاڑ کے نیچے جو پٹی تھی اسے گہرے رنگ کا کر دیا اس سے وہ پہاڑ کے اوپر کے رنگ سے ہم آہنگ ہو گیا۔ اس سے دس فیصد کاغذ بچنے لگا تھا۔ اس کے شاید اربوں کھربوں ڈبے چھپ چکے ہیں اور اس سے بہت بڑی رقم کی بچت ہوئی ہو گی۔ یہ ڈیزائن آج تک برقرار ہے پھر جب صمد صاحب نے سائٹ کے علاقے میں پریمیئر ٹوبیکو کمپنی کی نئی فیکٹری کا افتتاح کیا تو اس کے لیے خاص طور سے مس فاطمہ جناح آئی تھیں اور وہ اس لیے کہ یہ پاکستان ٹوبیکو کمپنی کے مقابلے پر کام کر رہی تھی جو ایک غیر ملکی کمپنی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ پاکستان ہر معاملے میں آگے آئے۔ وہ اس موقع پر بہت خوش تھیں۔

میرے پاس گلیکسو کے ڈائریکٹر ای آر کاووڈ اکثر آتے رہتے تھے۔ ان کے نائب تھے ایم کیو قدوائی تو انہیں خیال آیا کہ ہم سے کام لیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم انہیں کرنافلی کاغذ پر چھاپ دیں گے۔ وہ راضی ہو گیا حالانکہ وہ انگریز تھا لیکن وہ بھی چاہتا تھا کہ جو چیز یہاں مل سکتی ہے وہ باہر سے نہ منگوائی جائے۔ ہم نے اسے چھاپا۔ یہ جو کرنافلی کاغذ تھا اس کی کٹنگ بے حد مشکل کام تھا۔ ہم نے اسے چھاپ کر دیا تو وہاں ان کی فیکٹری میں جو سپروائزر تھے، انہوں نے دیکھا کہ ہم تو باہر کا کاغذ استعمال کرتے ہیں۔ نہ جانے ہماری مشینوں پر یہ کاغذ چلتے بھی ہیں یا نہیں۔ لہٰذا انہوں نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ اسے ایک بار بھی استعمال نہیں کیا اور کہہ دیا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس پر مسٹر کاووڈ نے مجھ سے کہا کہ اس نے تو کام نہیں کیا۔ میں ان سے ملنے گیا اور کہا آیئے مشین پر دیکھتے ہیں کہ کیسے ٹھیک نہیں ہے پھر اس کی تصحیح کی جائے گی۔ اسے ٹھیک کریں گے۔ وہ راضی ہو گئے۔ ہم فیکٹری میں آئے تو سب پریشان، بھاگتے پھر رہے تھے۔ چار سپروائزر تھے، ان میں ایک کرسچن لڑکی تھی۔ شور ہو رہا تھا لاؤ نکالو، تلاش کرو۔ بالآخر وہ سب منہ لٹکا کر سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ بولے سچی بات ہے ہم نے استعمال ہی نہیں کیا۔ اس پر مسٹر کاووڈ بہت خفا ہوئے کہ تم لوگوں نے مجھے جمیل کے سامنے شرمندہ کر دیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ تمہارا کام صحیح نہیں ہے۔ یہاں پر نہیں چل رہا ہے۔ ہم نے اسی وقت کاغذ منگوایا اور اسے مشین پر استعمال کر کے دیکھا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ کاغذ کا بھی گرین ہوتا ہے یعنی یہ ایک طرف سے تو آسانی سے مڑ جاتا ہے اور دوسری طرف سے موڑنے پر ٹوٹ جاتا ہے۔ اب اگر ہم نے اسے مشین کے خلاف موڑ دیا تو یہ پھنس جاتا ہے اور دوسری طرف سے موڑنے پر ٹوٹ جاتا ہے اور تڑ مڑ کر رہ جاتا تھا اور صحیح طرف سے اسے مشین میں ڈالتے تھے تو مشین اسے پکڑ لیتی تھی۔ لکس کے ریپر جن کاغذوں پر چھپے تھے ان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ اس کے لیے خصوصی کاغذ منگوایا گیا تھا جس میں گرین نہیں ہوتا تھا۔ یہ گلابی رنگ کا بڑا خوب صورت کاغذ تھا۔ اس میں چل جاتا تھا کہ صابن کا پیکٹ گول نما ہی ہوتا ہے لیکن گلیکسو کے لیبل میں مسئلہ ہو گیا تھا کیونکہ کاغذ کو غلط گرین سے موڑ دو تو ڈبا کچھ گول سا ہو جاتا تھا۔ صحیح طرف سے موڑنے پر بالکل چوکور ساخت آئی تھی۔ اگر اس میں بغیر گرین والا کاغذ لگتا تو یہ صحیح سے مڑتا نہیں۔ میں نے ہمیشہ کہا کہ میں نے اپنے گاہکوں سے سیکھا کیونکہ وہ میرے پاس ایسے ایسے مسئلے لے کر آتے تھے کہ یا تو میں انہیں حل کرتا۔ ورنہ گھر بیٹھا رہتا۔ شہر میں کرنے والے اور بھی تھے۔ میں ہر کام میں کوشش کرتا تھا کہ یہ ہر لحاظ سے بہتر اور ٹھیک ہو۔ میں نے اپنے کام کا خود ایک معیار بنا رکھا تھا اگر اس پر کام پورا نہیں اترتا تھا تو میں خود اسے مسترد کر دیتا تھا۔

میرے پاس ایک کمپنی کا کام تھا اس میں ہاف ٹون الگ چھپتا تھا اور لائن الگ چھپا کرتی تھی۔ اب تو سب ساتھ ہی چھپتا ہے لیکن اس وقت ہاف ٹون کے بلاک الگ ہوتے تھے اور لائن کے الگ۔ جب میں نے اسے آفسٹ پر چھاپا تو اسی طریقے سے چھاپا تھا پھر میں نے سوچا کہ میں

لیٹر پریس سے ہٹ کر کام کرتا ہوں۔ انہیں ایک ساتھ کیوں نہیں چھاپ دیتا مگر مسئلہ تھا پلیٹ کا کہ پلیٹ اس طرح بنائی جائے کہ دونوں چیزیں ایک ساتھ کاغذ پر چھپ جائیں۔ اس وقت فلم کے بجائے شیشے کی پلیٹ پر نیگیٹو بنا کرتے تھے۔ میں نے ڈیزائن کو دو دفعہ ایکسپوز کیا ایک ہی پلیٹ پر اور اس کے لیے میں نے پن مارک کاٹے جس کی وجہ سے نیچے بھی دکھائی دیتا تھا۔ پنسل سے نشان لگایا پلیٹ کے اوپر اور ایک پر رکھ کر ایک چھاپ دیا۔ اس سے رنگ بچا اور کوالٹی کہیں بہتر ہوگئی۔ کیونکہ اس میں سب کچھ ایک پلیٹ سے چھپا تھا۔ میں نے کمپنی کو بھی بتا دیا کہ دیکھو میں ایسے یہ کام کر رہا ہوں تاکہ اسے بھی شکایت نہ ہو۔ اس شخص نے پیسے تو دو پلیٹوں کے لیے لیکن اسے ایک پلیٹ پر چھاپ رہا ہے۔ میں نے ان سے کہا آئندہ پیسے کم کر دوں گا تو وہ بھی خوش ہوگئے کہ اب کام بھی اچھا اور جلد ہوگا اور پیسے بھی بچیں گے۔ اس طرح سے میں نے بہت سارے کام اپنے گاہکوں سے سیکھے تھے۔ میں ان کو حل کر کے دیتا تھا، ایک تو خوب واہ واہ ہوتی تھی، دوسرے کام خوب آتا تھا کہ ایک، دوسرے سے ذکر کرتا تھا۔

اب تو پرنٹنگ کے وہ مسائل نہیں رہے ہیں جگہ جگہ اسکینر لگ گئے ہیں لیکن جب یہ سب نہیں تھا تو آدمی کی بڑی اہمیت تھی۔ استاد ہوا کرتے تھے جو اپنا علم چھپاتے تھے دوسروں کو بتاتے نہیں تھے۔ جب میں نے سکھایا نئے آنے والوں کو تو وہ مجھ سے بھی خفا ہوئے لیکن کام رکتا نہیں ہے اب استاد نہیں ہیں ان کے بجائے مشینیں ہیں ان سے کہیں بہتر کام کر رہی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کسی علم یا فن کو اپنے سینے میں دبائے رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی خزانے کو زمین میں دبا کر رکھا جائے نہ خود فائدہ اٹھایا جائے اور نہ دوسروں کو اٹھانے دیا جائے۔ خزانے کی تو پھر بھی اہمیت ہوتی ہے لیکن فن کو چھپایا جائے تو کچھ عرصے بعد اس کی وقعت نہیں رہتی ہے۔ نئے لوگ نئے طریقے سیکھ لیتے ہیں اور پرانے طریقے متروک ہو جاتے ہیں۔

کاشف زبیر: یعنی آپ نے اپنی ترقی کو خود تک محدود نہیں رکھا بلکہ ساری انڈسٹری میں پھیلا دیا۔

مرزا صاحب: ہاں اس لحاظ سے بڑا فائدہ ہوا کہ مجھے آج اطمینان ہے، میں نے اپنے شعبے کا حق ادا کر دیا، یہ اطمینان کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ میں نے بے حساب لوگوں کو کام سکھایا جو آج ساری دنیا میں مصروفِ عمل ہیں۔ طباعت میں ایک معیار قائم کیا۔ اس سے دوسروں کو ترغیب ہوئی کہ وہ بھی اس معیار کا کام کریں۔ اس سے ملک کا نام بھی روشن ہوا کیونکہ باہر سے آنے والے کہا کرتے تھے کہ جو کام پاکستان میں ہو رہا ہے وہ تو ہندوستان میں بھی نہیں ہو رہا۔ اس وقت ہمارے پاس مشینیں اچھی تھیں ہمارے ہاں اسکینر کی ٹیکنالوجی آ گئی تھی جو ان کے ہاں بہت بعد میں آئی تھی۔ پاکستان میں شروع سے اعلیٰ معیار کا کام ہوتا رہا۔ حالانکہ جب پاکستان بنا تو یہاں پر کچھ بھی نہیں تھا۔ ہندوستان میں چھپائی سستی ہوتی ہے کیونکہ ان کے ہاں کاغذ بے حساب ہے اور خام مال بھی بنتا ہے لیکن وہ معیار نہیں تھا۔ وہاں پریس کی صنعت نے بڑی ترقی کی ہے۔

کاشف زبیر: ایک زمانے میں مشرقی پاکستان میں جو کاغذ بنتا تھا وہ یہاں آتا تھا بعد میں یہ سب انڈیا جانے لگا۔ خود انڈیا میں بھی بہت اچھا کاغذ بنتا ہے۔

مرزا صاحب: جی ہاں۔ اچھا ایک چیز جو میں نے دنیا بھر میں دیکھی، مغرب میں کاروباری ادارے صدیوں سے قائم ہیں۔ اسی طرح برصغیر میں ہندوؤں کے چند ادارے پیڑھی در پیڑھی چلے آ رہے تھے لیکن مسلمانوں میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ خاص طور سے تجارتی اداروں کی، میں نے کوشش کی ہے کہ میں نے جو ادارہ قائم کیا ہے ایلیٹ کا تو یہ آنے والے دور میں بھی چلتا رہے۔ 1974ء میں، میں نے اپنے آپ کو اس کی ذمے داریوں سے الگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ میں نے اس وجہ سے کیا کہ اگر میں بدستور ادارے میں بیٹھا رہتا اور کام دوسروں کو دے دیتا تو وہ میرے ہی دباؤ میں رہتے اور آزادی سے کوئی کام نہیں کر پاتے، انہیں فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آتی ذرا ذرا سی باتوں کے لیے میری طرف دیکھا کرتے۔

ایلیٹ سے الگ ہونے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں نے پوری توجہ نوری نستعلیق کی طرف لگا دی۔ میں نے اپنا وقت سید صاحب کے ساتھ گزارا اور اس کے نتیجے میں مجھے سوچنے کا موقع ملا۔ فیکٹری کے روزمرہ کے ماحول کے دباؤ سے آزاد ہو کر میں کھل کر سید صاحب سے اس موضوع پر بات کرتا اور ہمارے درمیان روزانہ دو تین گھنٹے تک اس پر بات ہوا کرتی تھی۔ اب اگر میں سائٹ والی فیکٹری میں ہوتا تو کہیں پندرہ دن مہینے بھر بعد سید صاحب سے ملاقات ہوا کرتی۔ ظاہر ہے نہ ہم اردو کی مشینی طباعت پر بات کرتے نہ نوری نستعلیق کا خیال ذہن میں آتا اور نہ ہی یہ وجود میں آتی۔ اس وقت کچھ لوگ مجھ سے کہا کرتے تھے۔ میں فیکٹری نہ جا کر غلطی کر رہا ہوں۔ میں نے ان سے کہا دیکھو

اب اگر بچے اچھا کام کررہے ہیں تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ انہوں نے اچھا کام کیا ہے۔ حالانکہ میں وہاں صرف بیٹھا رہوں گا۔ انہیں کوئی کریڈٹ نہیں دے گا۔ بالکل برگد کے درخت کی طرح جس کی جڑیں دور تک پھیل جاتی ہیں اور اس کے نیچے کچھ نہیں لگتا ہے کیونکہ اس کے نیچے دھوپ اور ہوا نہیں آتی ہے تو جب تک میں دور نہیں بیٹھوں گا یہ کچھ نہیں کریں گے۔ اب میں دور ہوں' یہ اچھا کرتے ہیں تو ان کا نام اور خراب کرتے ہیں تو ان سے زیادہ دور نہیں بیٹھا ہوں۔ صرف دس میل کا فاصلہ ہے۔ مشورے کے لیے ہر وقت حاضر ہوں اور پھر کلر سپریشن کا شعبہ میں نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ محمد علی سوسائٹی والے دفتر میں اگر انہیں کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ فوراً میرے پاس آسکتے تھے۔ اس کا مثبت اثر ہوا اور بچے آزادانہ کام کرنے کے عادی ہوگئے پھر میں نے کلر سپریشن کا ڈیپارٹمنٹ بھی وہیں بھجوا دیا تھا۔ 1990ء میں، میں نے کہہ دیا کہ اب میں باقاعدگی سے دفتر نہیں آؤں۔ ستر برس کی عمر ہوگئی ہے اور میری ہمت نہیں ہوتی۔ ہاں تم لوگوں کو مشورے کی ضرورت ہے تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔ یہیں رہتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا مجھے جنون تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار فراہم کروں اور اس قسم کی کوئی مشین نہ لگاؤں جو انسانوں کے بجائے کام کرتی ہو۔ بہت عرصے تک میں اس پر کاربند بھی رہا لیکن پھر لوگوں نے مجھے مجبور کردیا۔ یونین کے چکر شروع ہوگئے اس میں زیادہ زور تخریب کاری اور کام نہ کرنے پر تھا۔ کئی افراد ایسے بھی تھے جو ملازم تو میرے ہاں تھے لیکن انہیں اصل تنخواہ کہیں اور سے ملا کرتی تھی۔ تخریب کاری کی۔ رول اینڈ ریگولیشن پر عمل کرنے میں مجھے کوئی مجبوری نہیں تھی لیکن یہ لوگ تو اپنے حلوے مانڈے کے لیے کام کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنا کوئی آدمی رکھوائیں یا اندر کا کوئی شخص خرید لیں۔ اس نے ایلیٹ کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ 1987ء میں پہلی اپریل کو جب کہ ایک دن پہلے اکتیس مارچ کو میری والدہ کا انتقال ہوا تھا اور انہوں نے غیر قانونی ہڑتال کا نوٹس دے دیا۔ میں نے ان سے کہا تم نے اچھا کیا میرا جو غم تھا اسے بانٹ دیا۔ پہلے مجھے صرف والدہ کا ہی صدمہ تھا لیکن اب یہ تھا کہ میرا دھیان اس طرف بھی رہے گا۔ میں نے کہا جو ہڑتال پر جانا چاہتا ہے شوق سے جائے۔ میں ان سے بات نہیں کروں گا۔ ان کے جو لیڈر تھے۔ میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ انہوں نے ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کیا تھا' وہ کہتے تھے بس دو دن کی بات ہے یہ خود آتے ہاتھ پاؤں جوڑتے۔ اب ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس پر بولے بس دس پندرہ دن کی بات ہے۔ جب یہ مدت بھی گزر گئی تو مہینے کی بات کرنے لگے۔ اس جتن میں تھے کہ کسی طرح کارکنوں کو ہڑتال پر برقرار رکھیں۔ روز میٹنگیں ہوتی تھیں۔ فیکٹری کے باہر مظاہرے ہوتے تھے کئی بار تو میرے دفتر تک چلے آئے۔ باہر کھڑے ہوکر خوب نعرے لگاتے تھے۔ جب مجھ سے بات کرنے کو کہا تو میں نے بتایا یہ لوگ خود ہڑتال پر گئے ہیں جس کا کوئی قانونی جواز نہیں بنتا ہے بلکہ ان لوگوں نے غیر قانونی کام کیا ہے۔ میں ان سے بات نہیں کرتا۔ چاہے یہ ساری عمر ہڑتال کرتے رہیں۔ اس طرح چار مہینے گزر گئے۔ کارکنوں کو تنخواہ نہیں ملی تھی۔ وہ مجبور تھے ایک روز سب کے سب میرے پاس آگئے اور بولے کہ ہم کام کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا میں نے کسی کو نکالا تو نہیں تھا۔ تو سب آئے اور بغیر کسی معاہدے کے کام کرنے لگے۔ اس کے تین مہینے بعد میرے کارکنوں نے لیبر ڈیپارٹمنٹ سے کہا کہ وہ مجھے سول آربیٹر مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انکار کردیا مگر پاکستان میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ادارے کے چیئرمین کو سول آربیٹر بنانے کی بات کی گئی تھی۔ تو میرے اندر کی ہمدردی نے انہیں بچالیا۔ آج میں سوچتا ہوں تو مجھے ان سب بدمعاشوں کو نکال دینا چاہیے تھا جو غلط کام کرتے تھے۔ بدمعاشی کرتے تھے لیکن میں نے سوائے مینجنگ کمیٹی کے کسی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ سدھرنے والے لوگ نہیں تھے' ان کی نظر میں میری ہمدردی بھی حماقت تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ اگلے حملے کے لیے سوچا کرتے تھے جو زیادہ سخت ہوتا۔ یہ لوگ باہر سے ہدایات لیا کرتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کارکنوں میں ان کے اور بھی لوگ تھے۔ جو کسی نئی گڑبڑ کے لیے بالکل تیار تھے۔ اگرچہ اس کے بعد انہوں نے ہڑتال تو نہیں کی لیکن کام میں گڑبڑ اور کارکنوں میں بددلی ضرور پھیلاتے رہے تھے۔ تو میں نے آہستہ آہستہ ان کی چھانٹی شروع کردی اور جہاں ڈیڑھ سو افراد کام کرتے ہیں۔ وہاں پانچ سو افراد کو روزگار ملا کرتا تھا۔ دیکھیے یہ بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔ وہ کمپنی جو پبلشنگ انڈسٹری میں مقابلتاً سب سے زیادہ معاوضہ دے رہی تھی۔ سہولتیں دے رہی تھی۔ جو کام کرنے والوں کے ساتھ عزت سے پیش آتی تھی۔ وہاں گڑبڑ کرکے انہوں نے ان لوگوں کا حق مارا کہ نہیں۔ اب سنیے یہ سارا چکر ان پانچ پانچ روپوں کے لیے

تھا جو وہ یونین فیس کے نام پر سب سے وصول کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک روزگار فراہم کرنے والے ادارے کا بیڑا غرق کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ 1992ء میں ایک اور یونین آ گئی کہ پرانے لوگ نا اہل تھے ہمیں ووٹ دو۔ ہمارا صدر چن لو۔ ہم تنخواہیں بڑھوائیں گے بونس دلوائیں گے۔ گویا جہاں ایک تھی وہاں دوسری آ گئی۔ اب ان میں آپس میں جھگڑے ہونے لگے۔ اس سے فیکٹری کا ماحول خراب ہونے لگا۔ میں ان سے کہتا تھا میں کوئی تیل کمپنی یا اخبار نہیں چلا رہا ہوں۔ جو تم کو چھ بونس دوں۔ وہ دے سکتے ہیں کیونکہ ان کا کام صرف چھپائی سے نہیں چلتا بلکہ اشتہارات بھی ہوتے ہیں، سرکولیشن بھی ہوتی ہے۔ میں ایک پریس چلا رہا ہوں۔ لہذا مجھ سے صرف وہی چیز مانگو جو میں دے سکتا ہوں۔

نعمان احمد: پہلے آپ کے پاس پانچ سو افراد تھے اب ڈیڑھ سو ہیں تو کیا اس سے پروڈکشن پر کوئی فرق نہیں پڑا؟

مرزا صاحب: پہلے میں ان لوگوں کی جگہ مشینیں نہیں لاتا تھا جو ہاتھ سے کام کرتے۔ صرف وہیں مشین ہوتی تھیں۔ جہاں اس کے بغیر کام نہیں چلتا تھا۔ اب آدمیوں کی جگہ مشینیں آ گئی ہیں اور اس کا ہماری پروڈکشن پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ یعنی ہماری سیلز بڑھی ہے کم نہیں ہوئی ہے۔ ہاں اس کا اثر اب جا کر پڑا ہے جی ایس ٹی سے۔ جو لوگ جی ایس ٹی نہ دے کر کم لاگت پر کام کرتے ہیں انہوں نے ہم سے خاصا بزنس چھین لیا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس میں بعض بڑی کمپنیاں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ وہ بے نام ونشان کمپنیوں کے لیے کام کر کے دے رہی ہیں اور بغیر جی ایس ٹی کے بزنس کر رہی ہیں۔ اس طرح کام کروانے والے کو بھی علم ہے کہ جو کمپنی کام کر کے دے رہی ہے وہ ایک دن کے لیے بھی کاغذات پر وجود میں نہیں آئی ہے اور فلاں پریس سے کام کرا کے دے رہی ہے لیکن انہیں کوئی پروا نہیں ہے کیونکہ ان کا بل تو کم آ رہا ہے۔

نعمان احمد: مزدور کی طرف سے عدم تعاون کی صورت میں آپ کے پاس مشینوں کا جو ٹرمپ کارڈ تھا، کیا آپ نے پہلے سے اس کے بارے میں سوچ رکھا تھا؟

مرزا صاحب: نہیں بلکہ ان لوگوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنا ہر ایک کے لیے روزگار والا نظریہ ترک کر دوں کیونکہ یہ روزگار کو ٹھکراتے تھے۔ میں ان کو سمجھاتا تھا۔ بتاتا تھا یہ تمہارا روزگار ہے اس کی عزت کرو۔ میں مثال دیتا تھا اپنے آرٹ مووی کے ایک ہندو ٹائپسٹ کی جو روزانہ دفتر گینڈے کا پھول لے کر آتا تھا اور کام شروع کرنے سے پہلے اسے سامنے رکھ کر پوجا کیا کرتا تھا اور پھر کام شروع کرتا تھا۔ میں نے اپنی فیکٹری میں دیکھا بہت سارے لوگ آتے ہیں اور مشین کو لات مارتے ہیں کہ کم بخت آج بھی چل رہی ہے آرام کرنے کا موقع نکل گیا۔ میں نے ان سے کہا دیکھو یہ فرق ہے۔ ہم میں اور ان میں، آج وہ ترقی کرتے ہوئے کہاں جا پہنچے ہیں اور ہم اب تک وہیں بیٹھے ہیں۔ ہمارے مزاج میں کچھ ایسی چیزیں شامل ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے ہم اپنے ملک میں کام کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ ہاں جب باہر جاتے ہیں تو خوب کام کرتے ہیں۔

کاشف زبیر: کیا یہ سسٹم کی خرابی ہے؟

مرزا صاحب: بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں فرائض کا کوئی نہیں کہتا۔ ہاں حقوق کا سب شور مچاتے ہیں۔ یہ سب تمہارا ہے تمہارا خون چوس کر بنایا گیا ہے اسے حاصل کر لو۔

کاشف زبیر: تو کیا اس سوچ کا ہمیں نقصان نہیں ہوا ہے؟

مرزا صاحب: بہت زیادہ ہوا ہے۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ پچھلے کچھ عرصے میں پانچ سو بڑے صنعتی یونٹ بند ہوئے ہیں۔ اگر فی یونٹ سو افراد بھی شمار کیے جائیں تو پانچ لاکھ افراد بے روزگار ہوئے ہیں۔

کاشف زبیر: پچھلے کچھ سالوں میں بے روزگاری بہت تیزی سے پھیلی ہے۔

مرزا صاحب: اب بھی بہت سارے لوگ میرے پاس آتے ہیں کہ صاحب کام دے دیجئے اور جب کہ میں اپنی ورک فورس کم کر رہا ہوں تو یہ مجھ سے روزگار مانگتے ہیں۔ میں کہاں سے روزگار دوں، روزگار کو تو لوگوں نے خود ٹھکرا دیا۔ ورنہ پہلے جو بھی کام کے لیے آتا تھا، میں کہتا تھا لگ جاؤ، جہاں اتنے لوگ ہیں وہاں تم بھی سہی۔

کاشف زبیر: آپ ایک کامیاب بزنس مین بھی ہیں آپ کے خیال میں مکمل نجی معیشت اپناتے ہوئے اور ہمارے لوگوں کے اس مزاج کو بدلتے ہوئے کتنا عرصہ لگے گا جو سرکاری اداروں میں کام کرنے سے پیدا ہوا جب معیشت قومیائی گئی تھی۔

مرزا صاحب: اس چیز کو معمول پر آنے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ ہائر اینڈ فائر کی ہے۔ امریکا جیسے ملک میں معاش ہائر اینڈ فائر کے نظریئے کے مطابق کام کرتی ہے۔ یعنی آپ جب چاہیں کارکن کو ملازمت سے جواب دے دیں۔ اس میں آسانی رہتی ہے۔ آدمی ہر وقت

اپنے کام میں دلچسپی لیتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے اسے کسی وقت بھی ہٹایا جاسکتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کو ملازمت سے نکالنا ممکن نہیں ہے۔ جب تک اسے چارج شیٹ نہ دی جائے۔ یہ قصہ بھی لمبا ہے چارج شیٹ لیبر ڈیپارٹمنٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد یونین اسے عدالت میں لے جاتی ہے تو یہ ایک جھمیلا سا بن جاتا ہے۔ اس سے جو کارکن ہیں۔ ان کو لوگ اکساتے ہیں کہ کم کام کرو۔ ذرا آہستہ کرو۔ گڑبڑ کرو کہ کوئی تمہیں نکال نہیں سکتا ہے۔ پرنٹنگ تو اس معاملے میں اور بھی نازک کام ہے۔ آپ نے سب کچھ اچھا کرلیا لیکن جب چھاپنے کا مرحلہ آیا مشین ایک ذرا سا ٹیڑھا رکھ کر کاٹ دیا۔ لیجیے پورا کام خراب۔ ذرا سی چلتی مشین کو ٹھوکر ماردی تو کام خراب اگر پچاس شیٹیں خراب ہوگئیں تو پچاس کتابیں گئیں۔ اب آپ اسے دوبارہ چھاپیں۔ کیونکہ گاہک کہے گا۔ مجھے تو اتنی کتابیں چاہئیں، میں نے اتنے کا آرڈر دیا تھا۔ کارکن چاہے تو لمحے بھر میں آپ کا بے حساب نقصان کرسکتا ہے اور اس پر آپ اسے صرف نصف فی صد کے حساب سے جرمانہ لگاسکتے ہیں اور وہ بھی جب ساری انکوائری ہوجائے اور کارکن کی خطا ثابت ہوجائے تو اس کے بعد ایک لاکھ روپے کے نقصان پر صرف پانچ سو روپے جرمانہ لگے گا۔ یہ پانچ سو روپے آپ قسطوں میں کاٹ سکتے ہیں یک مشت نہیں۔ اس سے کارکنوں میں بے پروائی آتی ہے اور وہ اکثر کام خراب کردیتے ہیں۔

کاشف زبیر: آپ نے ہائر اینڈ فائر کا حوالہ دیا۔ دیکھیے ہم بہ حیثیت قوم اور معاشرہ صحیح معنوں میں پروفیشنل نہیں ہیں چاہے وہ ورکر ہوں یا منیجمنٹ۔ اگر یہ ہائر اینڈ فائر ہمارے ہاں بھی نافذ ہوجائے تو کیا اس سے انتظامیہ کو ضرورت سے زیادہ اختیارات حاصل نہیں ہوجائیں گے۔ کیا اس کی وجہ سے ذاتی پسند ناپسند کی بنیاد پر فیصلے نہیں ہونے لگیں گے؟

مرزا صاحب: اچھا سوال کیا ہے آپ نے اور آپ درست کہہ رہے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک آدمی اگر اچھا کام کررہا ہے اور میں اس سے مطمئن ہوں تو میں اسے کبھی نہیں ہٹاؤں گا۔ جب تک اس میں اور خرابیاں سامنے نہ آئیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز تو آج بھی موجود ہے یعنی ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر فیصلے۔ اب جو آدمی مجھے پسند نہیں ہے میں اس کے خلاف فائل بھرتا رہوں گا اور جب موقع ملے گا اسے نکال باہر کروں گا لیکن اس سے اور خرابیاں پیدا ہوں گی۔ ہائر اینڈ فائر سے میں سمجھتا ہوں کہ چند افراد سے زیادتیاں ضرور ہوں گی لیکن مجموعی طور پر اس سے فائدہ ہوگا۔ لوگوں کے دماغ میں آجائے گا کہ صحیح طریقے سے کام کروگے تو ٹھیک رہوگے ورنہ جاب سے جاؤ گے۔

کاشف زبیر: ہائر اینڈ فائر ایک معمولی سی تھیوری نہیں ہے بلکہ اس کا پس منظر معیشت پر لاگو ہوتا ہے۔ امریکا میں دیکھیں تو پنشن اور فنڈ جو ریٹائرمنٹ کے بعد ملتا ہے۔ وہ آجر کی نہیں بلکہ حکومت کی ذمے داری ہے۔ حکومت اس کی آمدنی میں سے ایک خاص رقم کاٹتی ہے اور جب وہ شخص ریٹائر ہوجاتا ہے تو یہ حکومت کی ذمے داری بن جاتی ہے کہ اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھے۔ ہمارے ہاں یہ پورے طور پر نافذ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہماری حکومت اس قابل ہے کروڑوں کی تعداد میں ریٹائرڈ حضرات کی کفالت کرسکے؟

مرزا صاحب: آپ نے اچھا نقطہ اٹھایا ہے۔ ہمارے ہاں بھی اولڈ ایج بینیفٹ فنڈ اور پنشن کا قانون عرصے سے کام کررہا ہے۔ اب جو بھی شخص کام کرتا ہے اور اس کا آجر ان قوانین کی پاسداری کرتا ہے تو وہ کارکن کی تنخواہ کا ایک حصہ حکومت کے پاس جمع کراتا ہے۔ کارکن کی پنشن بن جاتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد قانون کے مطابق اس کا جتنا بھی حصہ بنتا ہے۔ اب یہ دس فیصد ہے۔ ستر فی صد یا پچاس فیصد۔ یہ اسے ملے گا۔ ہمارے ہاں بے شمار لوگ ہیں۔ جو اس اسکیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور انہیں نہ صرف ریٹائرمنٹ کے بعد ایک رقم ملتی ہے بلکہ وہ گھر بیٹھے پنشن حاصل کرتے ہیں۔ اب یہ فائدہ تو انہیں ہے ناں، اسے مزید بڑھایا جاسکتا ہے۔

کاشف زبیر: میں اسی چیز کی نشان دہی کررہا ہوں۔ امریکا میں ہر شخص جس کا ایک سوشل سیکیورٹی نمبر ہو۔ چاہے وہ کہیں بھی کام کرتا ہے کسی نوعیت کا کام کرتا ہے۔ اسے ریٹائرمنٹ کی عمر تک پہنچنے کے بعد وہ تمام فوائد حاصل ہوں گے جو ہمارے ہاں بمشکل دس فیصد لوگوں کو ملتے ہیں اور باقی نوے فیصد لوگ ان سے محروم ہیں۔ امریکا میں تو آجر ایک مخصوص رقم ادا کرکے بری الذمہ ہوجاتا ہے اور باقی ساری ذمے داری حکومت کی ہوجاتی ہے اب امریکی حکومت کے پاس تو پیسہ ہے کہ وہ تین چار کروڑ ریٹائرڈ حضرات کی پنشن کا بوجھ سنبھال سکے کیا ہماری حکومت جس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہی پیسہ ہے، یہ ذمے داری نبھا سکے گی؟

مرزا صاحب: دیکھیے۔ یہ سب وقت کے ساتھ ساتھ

ہو گا۔

کاشف زبیر: پنشن اور فنڈ کے دیگر مسائل بھی ہیں جو بے چارے ساری عمر تنخواہ کٹوا کر رقم سرکار کے پاس جمع کراتے ہیں۔ جب اسے لینے کا وقت آتا ہے تو انہیں خواہ مخواہ کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ بعض بے چارے تو مایوس ہو کر لعنت بھیج کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔

مرزا صاحب: سرکاری محکموں کی حد تک ایسا ضرور ہوتا ہے۔ مگر نجی اداروں کے ریٹائر ملازموں کو عام طور سے ایسی پریشانیوں سے واسطہ نہیں پڑتا ہے۔ میرے کارکنوں نے آج تک اس بارے میں کوئی شکایت نہیں کی ہے حالاں کہ میں ان سے پوچھتا رہتا ہوں کہ انہیں پنشن وغیرہ صحیح طریقے سے مل رہی ہے یا نہیں۔ دو چار دفعہ انہیں جانا پڑتا ہے۔ لیکن ان کا کام ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کاغذات درست رکھیں۔ ورنہ سچ مچ مسئلہ بن جاتا ہے اس پر ایک واقعہ ہے آپ بھی لطیفے کے طور پر سن لیں۔ پنشن کے محکمے میں جو صاحب پنشن کے کاغذات وصول کرتے تھے۔ بغیر رشوت کے کسی کو کاغذات نہیں دیا کرتے تھے۔ آنے والے کو خوب پریشان کرتے تھے اور جب تک اپنا حصہ وصول نہیں کر لیتے تھے، تنگ کرتے رہتے تھے۔ ان کی حرکتوں سے ان کے دفتر والے بھی تنگ تھے۔ ان کا ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا اور جب ان کی پنشن جاری ہونے کا وقت آیا تو وہ دفتر پہنچے کہ بھئی میرا کام کرو۔ دفتر والوں نے کہا کیوں نہیں کریں گے صاحب۔ آپ کا کام نہیں کریں گے تو پھر کس کا کام کریں گے۔ چار روز بعد آیئے گا۔ وہ چار روز بعد پہنچے لیکن کام نہیں ہوا تھا اسی طرح تین چار دن کر کے مہینہ گزار دیا۔ ایک روز انہوں نے بھرے دفتر میں سب کو گالیاں دیں۔ اس پر اب جو پنشن جاری کرنے والے صاحب تھے، بولے کل آپ کے کاغذات ضرور مل جائیں گے۔ اس پر وہ صاحب بولے دیکھا...... لاتوں کے بھوت تھے ناں باتوں سے نہیں مانے جب گالیاں دیں تو سدھرے۔ اگلے روز گئے تو انہیں کاغذات مل گئے۔ کاغذ لے کر کھڑکی پر پہنچے کہ اب مجھے پنشن دیجئے وہاں جو صاحب بیٹھے تھے بولے۔ منہ کھولئے۔ کہنے لگے یہ کیا بدتمیزی ہے۔ بولے سامنے کے چار دیکھنا چاہتا ہوں اس کے لئے منہ کھولئے۔ پوچھا وہ کیوں۔ بتایا کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ کے سامنے کے چار دانت غائب ہیں۔ اس پر وہ بگڑ گئے۔ رشوت کا پیسہ کھایا تھا خوب تگڑے تھے۔ سارے دانت سلامت تھے۔ شور کرنے لگے ایک بار پھر سب کو گالیاں دیں اور دفتر جا پہنچے۔ بولے یہ کیا بدمعاشی کی ہے کاغذات میں۔ دفتر والے کہنے لگے معاف کیجئے گا غلطی ہو گئی۔ تو کیا آپ کے دانت سامنے سے ٹوٹے ہوئے نہیں ہیں۔ کہنے لگے کہاں ٹوٹے ہیں اتنے پکے دانت ہیں کہ میں اخروٹ توڑ سکتا ہوں ان سے۔ دفتر والے بولے صحیح کر دیتے ہیں۔ آپ پرسوں آیئے گا۔ غرض کہ اسی طرح دوبارہ سے چکر دینے شروع کر دیئے اور بالآخر ان کو اپنے سامنے کے چاروں دانت نکلوانے پڑے تب کہیں جا کر پنشن ملی تھی۔ دراصل ہمارے ہاں دفتری نظام ایسا ہے کہ اگر ایک بات کاغذ پر آ جائے تو بے شک یہ غلط ہو تب اس کی تصحیح بے حد مشکل ہوتی ہے۔

کاشف زبیر: اب ذرا ذکر ہو جائے اس قرآن شریف کا جسے آپ کے والد صاحب نے ابتدائی طور پر کتابت کیا اور اس کے بعد آپ نے اسے اس طرح شائع کیا کہ اس کی نظیر پوری تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

مرزا صاحب: قرآن شریف کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب **1951**ء میں جب میں نے ایلیٹ کا آغاز کیا تو سب سے پہلے والد صاحب نے فرمائش کی کہ میں ایک قرآن پاک چھاپوں۔ میں نے ان سے مؤدبانہ عرض کیا کہ چھاپنا کوئی مسئلہ نہیں۔ مکینکل کام ہے۔ مسئلہ ہے قرآن کریم کی کتابت کا اگر آپ اس کی کتابت کریں اور تصحیح کے بعد جب تیار ہو جائے گا تو شائع کر دیں گے۔ اس میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ اس جستجو میں کافی وقت گزر گیا کہ اسے کون لکھے۔ کاتب کہاں سے آئے۔ اب تلاش شروع ہوئی کئی کاتب آئے لیکن ابا جان کو کسی کا خط پسند نہیں آیا۔ ایک صاحب حافظ یوسف صدیق اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ بڑے اعلیٰ پائے کے خوش نویس تھے اور ابا جان کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے لاہور سے ایک صاحب کو بھیجا اور کہلوایا کہ یہ آپ کو قرآن کریم کتابت کر کے دیں گے۔ ان کی جب والد صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے شرائط پیش کرنا شروع کر دیں کہ سات سو روپے مہینہ لوں گا اور تین برس میں لکھوں گا۔ والد صاحب نے کہا کہ میں تمہیں ہزار روپے دوں گا۔ وہ یہ سمجھے کہ اب یہ مدت کم کریں گے کہ تین سال سے پہلے کام مکمل کرو لیکن والد صاحب نے انہیں کہا میں آپ کو پانچ سال دیتا ہوں۔ اب ان کے کان کھڑے ہوئے کہ یہ تو معاوضہ بھی زیادہ دے رہے ہیں اور وقت بھی میرے مطالبے سے زیادہ دے رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا

صاحب خط تو دکھایئے کہ کس خط میں لکھنا ہوگا۔ اس پر والد صاحب نے وہیں سے کاغذ لیا اور اس پر لکھنا شروع کردیا۔ اس وقت والد صاحب ایک تصویر بنا رہے تھے اور کتابت کے لیے نہ تو ان کے پاس خاص کاغذ تھا اور دوسرا سامان بھی نہیں تھا۔ انہوں نے سورۂ فاتحہ لکھ کر دے دی۔

اچھا والد صاحب کے بارے میں بتا دوں کہ وہ آرٹسٹ تھے۔ خوش نویس تھے۔ طغرے وغیرہ بنایا کرتے تھے لیکن انہوں نے کبھی کتابت نہیں کی تھی تو اس وقت والد صاحب نے جتنی تیزی سے اور جتنی اچھی لکھائی میں سورۂ فاتحہ لکھ کر دی تو کاتب حیران رہ گیا تھا۔ والد صاحب نے کہا اس خط میں لکھنا ہے تو وہ صاحب بولے نہیں جناب جتنی جلدی اور جتنے اچھے انداز میں آپ نے لکھا ہے میں نہیں لکھ سکتا۔ والد صاحب نے اصرار کیا کوشش تو کر کے دیکھو لیکن وہ نہیں مانے برابر یہی کہتے رہے کہ اتنی تیزی سے اور اس خط میں لکھنا میرے بس سے باہر ہے اور چلے گئے۔ ان کے بعد کوئی نہیں آیا تو والد صاحب نے خاصے عرصے کے بعد یعنی جنوری **1966**ء میں اللہ کا نام لے کر خود ہی قرآن کریم کی کتابت شروع کردی۔ ابتدائی چند صفحے نمونے کے طور پر لکھے اور جب طے ہوگیا کہ اس سائز میں اور اس انداز میں لکھنا ہے تو اس کا ایک نمونہ چھپوا کر رکھ لیا تاکہ ہر وقت سامنے رہے اور معیار کے طور پر کام آئے۔ اس وقت والد صاحب کی عمر ستّر برس ہو چکی تھی اور کتابت ویسے ہی آسان کام نہیں ہوتا۔ خاص طور سے قرآن پاک کی کتابت تو جوکھم کا کام ہے۔ آدمی پوری توجہ اس پر لگا دیتا ہے۔ والد صاحب نے بڑی ہمت کی اور بڑی تیزی سے صرف چھ مہینے میں کوئی نو پارے کتابت کر ڈالے۔ کل ایک سو اٹھاون صفحے لکھے تھے انہوں نے۔ اس کے بعد ان کی طبیعت وغیرہ خراب ہوگئی۔ وہ اسپتال میں داخل ہوگئے اور سارا کام رک گیا۔ اس کے بعد ذرا طبیعت سنبھلی اور گھر آئے تو دوبارہ کام شروع کردیا۔ دو چار صفحے لکھے تو مجھ سے کہا میں تو سمجھ رہا تھا کہ اب لکھنے کے قابل نہیں رہوں گا۔ ہاتھ پیر میں لرزش آجائے گی لیکن میں یہاں بیٹھا ہوں اور میں نے جو صفحہ لکھا ہے اسے دیکھ کر بالکل بھی محسوس نہیں ہوتا کہ اسے کسی بیمار آدمی نے لکھا ہے۔ میں نے ان سے کہا یہ تو اللہ کی مہربانی ہے آپ پر کہ اس نے آپ کو صحت دی مگر اس کے فوراً بعد ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور کتابت کا سلسلہ دوبارہ منقطع ہوگیا جو پھر بحال نہ ہو سکا اور **19** نومبر **1966**ء کے دن وہ انتقال کر گئے۔ اب سب کو ملال تھا کہ ان کا کام ادھورا ہی رہ گیا۔

چالیسویں والے دن میرے منجھلے بھائی ظہور احمد جو آرٹسٹ نہیں تھے، ان کو ایک دم یہ خیال آیا۔ انہوں نے کہا یہ جواب تک کتابت ہوا ہے اس کے تم فوٹو لو اور ان کو کاٹ کاٹ کر چپکا دو۔ میں نے ان سے کہا اللہ کا نام لو یہ قرآن کی کتابت ہے کوئی انگریزی حروف تو نہیں ہیں کہ کاٹ کاٹ کر چپکا دیں۔ اس میں نشست بھی ہوتی ہے اور روانی بھی۔ یہ ناممکن ہے۔ ایک سطر لکھنے کے لیے بھی کاتب کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ آگے کتنی جگہ بچے گی۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے یہ سمجھ کر یہ کام ناممکن ہے۔ اس وقت بات ختم کردی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسی دماغ میں ڈالی۔ میں نے کہا کوشش کر کے تو دیکھیں۔ ممکن ہے کہ ہو جائے۔ ایک ماہرِ فن کے طور پر مجھے معلوم تھا کہ یہ کام بہت مشکل بھی ہے اور بہت طویل بھی تو اب کس سے کہا جائے تو ابا جان کے ایک دوست تھے۔ منشی رضا حسین۔ وہ اس زمانے میں پریس میں میرے پاس بھی آتے تھے اور تھوڑا بہت کام بھی کرتے تھے۔ یہ سلمیٰ رضا جو اخبارات اور رسائل میں لکھتی ہیں' ان کے والد تھے۔ دوسرے صاحب تھے میرے چھوٹے چچا مخدوم احمد جو آرٹسٹ تھے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ بھائی ظہور نے یہ تجویز پیش کی ہے اور ان سے کہا کہ میرے دماغ میں اس کام کے لیے آپ دونوں کا نام آیا ہے۔ وہ بولے ہاں ہاں کیوں نہیں کریں گے۔ حالانکہ میرے دل میں یہ خیال تھا کہ یہ دونوں ہی حضرات خاصی عمر کے تھے۔ چچا جان ستّر برس کے تھے وہ والد صاحب سے دو برس چھوٹے تھے جبکہ رضا حسین چوہتر برس کے تھے۔ میرے دل میں تھا کہ نہ جانے کتنا وقت لگے اور ان اصحاب کو کام مکمل کرنے کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ اس پر اللہ نے میرے دل میں بات ڈالی۔ یہ کام تیرا تھوڑی ہے۔ زندگی اور موت تو میرے ہاتھ میں ہے۔ تیرا کام تو ہے کہ تو کرتا رہے۔ تو میں نے یہ کام اللہ کا نام لے کر ان کے سپرد کردیا اب جو حصے انہیں پسند آئے میں نے چھاپ کر ان کے حوالے کردیئے کہ اسے کاٹ کر اور چسپاں کر کے کام کا آغاز کریں۔ کئی ہفتے تک میں نے ان سے پوچھا نہیں کہ کام کہاں تک پہنچا۔

کاشف زبیر: اس کام کا آغاز کب ہوا تھا؟

مرزا صاحب: **1967**ء کے شروع میں۔ نومبر **1966**ء میں والد صاحب کا انتقال ہوا تھا اور اس کے چند مہینوں کے بعد اس کام کا آغاز ہوگیا تھا۔ جب ان بزرگوں

نے کام کا آغاز کیا کوئی تین مہینے تک میں نے دریافت نہیں کیا۔ کام کس حد تک ہوا ہے اور جب تین مہینے بعد میں نے دیکھا تو وہی ہوا تھا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ یعنی اس میں وہ روانی خوب صورتی اور سلاست نہیں پیدا ہوئی تھی جو اصل کتابت میں تھی مگر میں نے ان کی دل شکنی کے خیال سے کچھ نہیں کہا بلکہ ان سے کچھ اور بنانے کو کہا۔ حوصلہ پا کر انہوں نے پھر سے کام شروع کیا اور انہوں نے وہ پہلا صفحہ جو مجھے بالکل درست لگا تھا، کوئی چھ مہینے میں جا کر تیار کیا تھا۔ میں نے یہ کیا کہ جو ابا جان کے ہاتھ کا لکھا تھا اور جو جوڑ کر بنایا گیا تھا ان کا ایک ایک فوٹو لیا اور اس کی کاپیاں بنا کر لوگوں کو دیں لیکن کوئی نہیں جان سکا کہ کون سا ہاتھ سے لکھا ہے اور کون سا ٹکڑے جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ سب نے کہا کہ کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی عملِ وراقت سے بنایا جانے والا صفحہ ہو بہو ہاتھ سے کتابت شدہ صفحے جیسا تھا۔ تب مجھے اطمینان ہوا اور میں نے ان بزرگوں سے کہا کہ اب آپ اللہ کا نام لے کر شروع کریں۔ اس کے بعد ان بزرگوں کو یہ کام مکمل کرنے میں کوئی چودہ سال کا عرصہ لگ گیا تھا۔ اللہ نے ان کو صحت بھی دی اور استقامت بھی۔ ورنہ تو یہ تھا کہ ستر اور چوہتر برس کی عمر تھی کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ اللہ کے فضل سے دونوں نے یہ کام مکمل کر لیا تھا پھر پہلے 1979ء میں منشی رضا حسین صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میرے چچا حیات رہے لیکن ان کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو ذرا رکاوٹ ہوتی تھی لیکن 1980ء میں جا کے یہ کام مکمل ہو گیا تھا۔ میں نے نیگیٹیو بنوائے اور پلیٹیں وغیرہ بنوا کر اسے چھاپنے کا اہتمام شروع کر دیا تو ہمارے ایک دوست تھے اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ پریس میں ہی کام کرتے تھے حاجی منور محمد صدیق صاحب جو ہمارے آڈیٹر تھے۔ بڑے اللہ والے آدمی تھے۔ ہر سال حج کیا کرتے تھے۔ جب چھپائی کا مرحلہ آیا تو وہ وہاں کھڑے تھے۔ وہاں پر ایک صفحہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگے۔ جمیل اس میں تو غلطی ہے۔ میں چونکا کہ بھئی کیا غلطی ہے۔ بولے یہ تو رحمت کی میم غائب ہے۔ اس پر میں نے کہا سب کام روک دو۔ لہذا سارا کام روک دیا۔ حالانکہ اس قرآن شریف کو صحیح کا سرٹیفکیٹ مل چکا تھا۔ سرکاری حافظ تھے اللہ ان کو بھی جنت نصیب کرے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ حافظ محی الدین صاحب انہوں نے قرآن صحیح ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا تھا لیکن جب غلطی نکلی تو میں نے کہا مجھے یقین نہیں ہے کہ اس میں اور غلطیاں نہیں ہوں گی۔ لہذا میں نے قرآن پاک کی چار کاپیاں بنا کر حافظ محی الدین صاحب کے ساتھ تین اور حفاظ کو بھی دی تھیں اور ان سب نے ان کی الگ الگ تصحیح کی۔ میرے دفتر میں ایک لڑکی نشاط کام کرتی تھی۔ میں نے اسے دیا کہ ان سب کی ٹیبلیشن کرے اور دیکھے کہ کس حافظ نے کتنی غلطیاں نکالی ہیں۔ حساب کتاب کرنے پر معلوم ہوا کہ املا کی غلطیاں تو کوئی چوبیس ہیں لیکن زیر زبر پیش اور محراب وغیرہ کی غلطیاں ملا کر کل ایک سو اکیس تھیں۔ اب میں نے ان کی کریکشن کی۔ ان کی پھر سے فوٹو اسٹیٹ نکالی اور دوبارہ ان ہی حفاظ کو پڑھنے کے لیے دیا۔ اس پر ایک صاحب تو خفا ہو گئے تھے کہ ہم نے پڑھ دیا ہے دوبارہ کیوں پڑھیں۔ میں نے کہا اس کا آپ کو معاوضہ ملے گا اس لیے پڑھیں۔ میری تسلی ہو جائے گی کہ اب کوئی غلطی باقی نہیں رہی ہے مگر وہ نہ مانے۔ البتہ تین دوسرے حفاظ نے دوبارہ پڑھ دیا تو اس میں پھر چند ایک غلطیاں نکل آئیں۔ میں نے ان کی تصحیح کی اور دوبارہ ان کی کاپی نکالی اور پھر سے ان حفاظ کو دیا تو وہ بولے یہ شخص تو جان کو آ گیا ہے۔ میں نے ان سے کہا میں اس وقت مطمئن ہوں گا جب آپ سب کہیں گے کہ ہاں اب اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ تب میں اسے چھاپنے کی جسارت کروں گا۔ ورنہ مجھے بڑا صدمہ ہو گا اگر میں اس میں کوئی غلطی نکل آئی تو ان سب نے اسے چیک کیا اور خدا کے فضل سے اس بار ایک بھی غلطی نہیں آئی۔ بلکہ سب نے قرآن کریم کو مکمل طور پر درست قرار دیا۔

کاشف زبیر: ان غلطیوں کی تصحیح والے دور کو کتنا وقت لگا تھا؟

مرزا صاحب: یہ معاملہ تو کافی لمبا ہو گیا تھا۔ صرف کریکشن کرتے کرتے ہی چھ سات برس لگ گئے تھے۔ اب جن اصحاب نے یہ کام کیا تھا ان میں سے ایک تو اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور دوسرے کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا تو اس کی تصحیح کا اعزاز اس خاکسار کے حصے میں آیا۔ اس بندۂ ناچیز نے جتنی بھی تصحیح تھی وہ کی۔ الفاظ کاٹ کر اور چپکا کر اور 1988ء میں یہ کام مکمل ہوا تھا پھر 1989ء میں اس قرآن شریف کا پہلا ایڈیشن ہمارے ہاں چھپ کر تیار ہوا تھا تو تقریباً بائیس برس لگ گئے تھے۔ چودہ سال اس کے کرنے کے اور نو سال اس کی تصحیح کے۔

نعمان احمد: جب آپ کے سامنے ان طویل برسوں کی محنت آئی تو اس وقت آپ کے تاثرات کیا تھے؟

مرزا صاحب: میرے تاثرات اور جذبات جو تھے میں

انہیں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بس اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اس بندۂ ناچیز کو یہ کام مکمل کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔ ہاں اس سلسلے میں ایک اور بات بتاتا چلوں کہ 1983ء میں میرے ایک بھائی کا انتقال ہوا۔ یہ جنوری کا مہینہ تھا۔ ظہور بھائی منجھلے تھے۔ اسی سال میں اگست کے مہینے بڑے بھائی منظور احمد کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے خاندان اور خاص طور سے والدہ کے لیے یہ بڑے صدمے تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے ان کے دو بیٹے یکے بعد دیگرے چل بسے تھے تو میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے والدہ سے پہلے نہ بلانا کیونکہ انہیں دو بیٹوں کا صدمہ تو ہے ہی اور ان کی آخری منزل تک پہنچانے کے لیے ایک بیٹا ہو تو اچھا ہے تو اللہ تعالیٰ نے میری یہ دعا قبول کی اور دوسری دعا میں نے یہ کی یہ قرآن شریف مکمل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے احسان فرما کر اس گنہگار کی یہ دونوں دعائیں قبول کر لیں۔ والدہ صاحبہ 1987ء میں انتقال کر گئی تھیں اور وہ یہ قرآن شریف مکمل ہوتے نہیں دیکھ سکی تھیں مگر چچا موجود تھے۔ یہ ان کی محنت تھی جو ان کے سامنے آئی تھی اور یہ کام اتنے احسن طریقے سے ہوا کہ لوگ حیران رہ گئے جس نے سنا اور جس نے دیکھا اسے یقین نہیں آیا کہ کوئی قرآن شریف اس طرح بھی چھپ سکتا ہے۔ یہ دنیا کا پہلا اور غالباً آخری قرآن ہے جسے اس طرح عمل وراقت کے طریقے سے منفرد انداز میں مکمل کیا گیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے والد صاحب کی روحانی طاقت تھی جس نے اس کام کو مکمل کرایا تھا۔ کیونکہ نہ تو کتابت ان کا پیشہ تھا اور نہ ہی انہوں نے کتابت کی تھی۔ وہ خوش نویسی کرتے تھے لیکن دونوں میں خاصا فرق ہے یعنی کتابت اور چیز ہے اور خوش نویسی اور شے ہے۔ بظاہر ایک ہونے کے باوجود ان میں خاصا فرق آ جاتا ہے۔ تو وہ قلم اور کاغذ جس پر انہوں نے لکھا تھا کبھی میں اسے لے کر بیٹھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ ان صفحات میں وہ تسلسل اور روانی ہے جو آج کے کاتبوں کے لکھنے میں نہیں آتی ہے۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی روحانی قوت تھی جس نے ان سے یہ زبردست کام کرایا تھا اور اس طرح کرایا کہ رہتی دنیا تک کے لیے ایک مثال بن گئی۔

کاشف زبیر: والد صاحب نے یہ صفحات کتنے عرصے میں لکھے؟

مرزا صاحب: انہوں نے یہ صفحات چھ مہینے میں لکھے تھے پھر طبیعت خراب ہو گئی تھی اسپتال میں رہے۔ چند دن بعد آ کر چند صفحات اور لکھے۔ بس اس سے زیادہ کی انہیں مہلت نہیں ملی تھی۔

کاشف زبیر: یہ قرآن کریم کس خط میں لکھا گیا؟

مرزا صاحب: یہ خطِ سُلس کہلاتا ہے۔ ہم اسے پیش کے ساتھ سُلس پڑھتے ہیں۔ درحقیقت یہ لفظ زیر کے ساتھ سِلس ہے اور والد صاحب نے جس انداز میں لکھا ہم اسے کسی سے ملتا جلتا نہیں کہہ سکتے۔ یہ منفرد خط ہے یہی وجہ ہے کہ دوسرے کاتبوں نے اسے لکھنے سے یا کتابت کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ان کا ذاتی خط تھا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ اس کا یا فلاں کا خط ہے کیونکہ یہ کہیں اور نظر نہیں آتا ہے۔ یہ خاص حد تک نستعلیق سے مشابہ ہے۔ جو آج کل اردو کا عام خط ہے

کاشف زبیر: یعنی ہم لوگوں کے لیے اس خط میں قرآن پاک تلاوت کرنا آسان ہے بہ نسبت خطِ نسخ کے؟

مرزا صاحب: جی بالکل۔ آپ نے اچھی نشان دہی کی۔ یعنی اگر ہم اس خط میں بچوں کو قرآن کریم تلاوت کرنا سکھائیں تو وہ جلد ناظرہ ختم کرا سکتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ابا جان کا جیسا کہ بتایا کہ انہیں آرٹ کا شوق تھا اور ان کے بڑے بھائی جو ان سے کوئی سولہ برس بڑے تھے کاتب تھے۔ خاندان کا پس منظر مذہبی تھا اور اس میں آرٹ اور تصویر بنانا معیوب سمجھا جاتا تھا تو بڑے بھائی ابا جان کو منع کیا کرتے تھے کہ تصویر نہ بنایا کرو اور یہ رات کو چراغ جلا کر پنسل اور چارکول سے اپنی تصویریں اور ڈرائنگ بنانے میں لگے رہا کرتے تھے۔ حالانکہ بعض اوقات انہیں سزا بھی ملی لیکن آرٹ کا شوق نہ ختم ہوا۔ اس پر بڑے بھائی نے کہا کتابت اور خوش نویسی مشکل کام ہے اس لیے یہ اس سے جی چراتا ہے اور تصویریں بناتا ہے تو ابا جان نے خوش نویسی سیکھی اور دلی میں ہونے والے ایک مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا جبکہ وہ صرف سترہ برس کے تھے اور ان کے مقابلے پر ماہرِ فن تھے۔

اس زمانے میں ان پر روحانی کیفیت بھی طاری رہنے لگی اس کیفیت میں وہ دوسروں کے بارے میں بتاتے رہتے تھے جو سچ نکلا کرتا تھا اور اس کیفیت میں حفظِ مراتب ہٹ جاتا تھا۔ بھائی، باپ، استاد، چھوٹے اور بڑے سب سے ایک سے انداز میں بات کیا کرتے تھے۔ ایک دن ان پر بیٹھے بیٹھے کیفیت طاری ہوئی تھی تو انہوں نے بڑے بھائی سے کہا کاغذ لاؤ قلم لاؤ۔ کاغذ اور قلم لائے گئے۔ تو انہوں نے لے کر خطِ نسخ لکھنا شروع کر دیا۔ کئی کاغذ لکھ ڈالے۔

جب ان کی یہ کیفیت ختم ہوئی تو سب نے پوچھا کہ یہ کیا کررہے تھے۔ تم نے خطِ نسخ لکھا اور اتنا اچھا لکھ ڈالا۔ اس پر ابا جان نے بتایا کہ ابھی ابھی حضرت چراغ دہلویؒ آئے تھے اور مجھے یہ خط لکھا کر گئے ہیں حالانکہ حضرت چراغ دہلویؒ کوئی تین سو برس پہلے گزر چکے تھے۔

کاشف زبیر: جی وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ تھے؟

مرزا صاحب: جی بالکل والد صاحب ان ہی کا حوالہ دے رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ابھی سکھا کر گئے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کسی سے خطِ نسخ نہیں سیکھا تھا اور نہ ہی بعد میں انہیں تصحیح کی ضرورت پیش آئی تھی تو میں سمجھتا ہوں کہ اتنا بڑا کام یعنی قرآن کریم کی اس طرح کتابت ایک معجزہ ہے جس کا تعلق ان کی اس روحانی کیفیت سے جا ملتا ہے کہ اس عمر میں کتابت کرنا پھر ایک الگ ہی خط میں اتنی صفائی اور روانی سے لکھنا جو بعض بہت اچھے پیشہ ور کاتب بھی نہیں کر پاتے پھر قرآن کریم والد صاحب کے ہاتھ سے ہی مکمل ہوجاتا تو پھر اس میں یہ انفرادیت نہ آپاتی۔ یعنی یہ وراقت کے عمل سے بننے والا پہلا اور شاید آخری قرآن کریم نہ رہتا۔ میں آج سوچتا ہوں تو مجھے یہ سب اللہ میاں کی طرف سے خاص طور سے بنایا ہوا سیٹ اَپ لگتا ہے۔

نعمان احمد: بلاشبہ یہ شروع سے لے کر آخر تک ایک حیرت انگیز شے رہی۔

مرزا صاحب: پروفیسر حسنین کاظمی صاحب جو اردو کے ایک ممتاز ادیب ہیں انہوں نے اس قرآن شریف کے بارے میں مضمون لکھا تو اسے انہوں نے ''قرآن مجید کی کتابت کا معجزانہ عمل'' کا ٹائٹل دیا تھا۔ یہ چیز کسی معجزے سے کم نہیں ہے اور یہ ہم انسانوں کا نہیں بلکہ قرآن شریف کا معجزہ ہے کہ یہ کام یوں مکمل ہوسکا۔ اس کو اتنا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب بھی کسی ناواقف شخص کو بتایا جائے تو اسے بالکل یقین نہیں آتا کہ قرآن کریم اس طرح بھی کتابت ہوکر چھپ سکتا ہے۔

نعمان احمد: جب یہ قرآن کریم مکمل ہوکر آپ کے سامنے آیا تو آپ کے کیا احساسات تھے؟

مرزا صاحب: سب سے پہلے تو اللہ کا شکر اور اس کی عنایت کا احساس ہوا کہ اس نے مجھے یہ کام مکمل کرنے کا موقع دیا اور میری دعا قبول فرمائی کہ میری زندگی میں ہی یہ کام مکمل ہوجائے۔ جس دن میرے بڑے صاحب زادے خالد نے قرآن شریف کا پہلا نسخہ پیش کیا تو ہمارے ہاں عید میلادالنبی کا جلسہ ہورہا تھا۔ میں نے فوراً دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی تھی کہ قرآن کریم مکمل ہوکر چھپا اور میری زندگی میں چھپا۔ ورنہ میرے بعد بھی ہوسکتا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی تھی ہی نہیں۔ کتنے برسوں سے یہ نامکمل میں تھا اور میں منتظر تھا کہ یہ مکمل ہو۔ والدہ اکثر اس کے بارے میں پوچھتی رہتی تھیں اور اس کی پروگریس کا سن کر خوشی کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ بے شمار دعاؤں سے نوازتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابا جان کے ساتھ والدہ کی دعائیں بھی میرے ساتھ تھیں جو میں یہ کام مکمل کر پایا تھا۔ اس طرح میرے منجھلے بھائی ظہور احمد جنہوں نے عملِ وراقت سے قرآن شریف مکمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ اس زمانے میں صاحبِ فراش تھے۔ انہیں بون کینسر ہوگیا تھا اور وہ کیونکہ اٹھ نہیں سکتے تھے لہذا لیٹے لیٹے اس کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ جب **1979**ء میں قرآن کریم مکمل ہوگیا تو وہ بھی بے حد خوش ہوئے تھے افسوس کہ والدہ صاحبہ کی طرح وہ بھی اسے مکمل ہوتے اور پھر چھپتے نہ دیکھ سکے۔ **1983**ء میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ درحقیقت یہ قرآن شریف ہمارے پورے خاندان کی آرزوؤں کا مرکز بن گیا تھا۔

کاشف زبیر: مرزا صاحب اب آتے ہیں ذرا نوری نستعلیق کی طرف، اس پر بہت کچھ چھپ چکا ہے اور آپ نے اس کے ایک ایک لمحے کی تفصیل بیان کردی ہے۔ اب آپ پر الزام ہے کہ آپ نے اسے مکمل کیا اور دنیا کے سامنے چھوڑ دیا۔ اگر وہ اسے قبول کرتے ہیں تو آپ کو کوئی فائدہ نہیں اور اگر مسترد کیا جاتا ہے تو آپ کی ساری محنت ہی رائگاں چلی جاتی۔ بہرحال نوری نستعلیق آپ کی تخلیق تھی تو اس سے اتنی بے نیازی کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ نے اس سافٹ ویئر کو مزید ترقی دینے کے لیے کیا کیا؟

مرزا صاحب: یہ آپ نے اچھا سوال کیا اور مجھے وضاحت کا موقع دیا۔ دیکھیے نوری نستعلیق کا خیال میں نے ضرور پیش کیا لیکن میں نے اسے عملی طور پر نہیں بنایا تھا بلکہ اسے مونوٹائپ کارپوریشن انگلینڈ کے ایک ذیلی ادارے ملٹی لینگول نے تیار کیا تھا۔ **1984**ء میں میں نے اس میں اعراب کا اضافہ کروادیا۔ اس پر بعد میں بھی ملٹی لینگول نے کام کیا اور انہوں نے کچھ کام کانسپٹ سافٹ ویئر انڈیا سے بھی کروایا۔ اب جو اس کا جدید ترین سافٹ ویئر ہے نوری نستعلیق کا یعنی **INPAGE** اس کے اب ٹو پوائنٹ فور اور ٹو پوائنٹ سیون جیسے جدید ترین ورژن آپ کے ہیں۔ اب

یہ کمپوزنگ کا ایک مکمل پروگرام ہے۔ میں نے تو صرف ترسیمے تیار کر کے دیئے تھے۔ انہوں نے اس میں ٹکڑے بھی جوڑے۔ تب کہیں جا کر یہ پروگرام بنا اور کامیاب ہوا۔

نعمان احمد: آپ نے کسی سافٹ ویئر کمپنی سے مل کر اس پر مزید کام کیوں نہیں کیا پھر آپ کی نئی پیڑھی بھی سامنے آ چکی ہے۔ آپ کے بیٹے ہیں جو کمپیوٹر اور مینجمنٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں۔ انہوں نے نوری نستعلیق کو مزید بہتر کیوں نہیں کیا؟

مرزا صاحب: دیکھیے بنیادی طور پر انہیں ایک ادارہ چلانے کی تربیت دی گئی ہے اور وہ یہی کام کر رہے ہیں۔ ایک مینجمنٹ کی تربیت لے کر آئے تھے اور دوسرے اویس انہوں نے کمپیوٹر کی تربیت لی ہے اور انہوں نے سافٹ ویئرز بھی بنائے اپنی کمپنی کے لیے بھی اور دوسری کمپنیوں کو بھی بنا کر دیئے۔ سافٹ ویئرز بنانا خصوصی مہارت کا کام ہے۔ اس میں وقت بھی چاہیے۔ کمپیوٹر کی مہارت بھی چاہیے۔ آدمی بھی درکار ہیں اور رقم بھی۔ ظاہر ہے میرے لیے یہ کرنا مشکل تھا کیونکہ میرے اپنے کرنے کے بے شمار کام ہیں، یہ میری فیلڈ بھی نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو سارا کام اس چکر میں روک کر بیٹھ جائیں کہ میں خود کیوں نہ کروں کسی اور کو کیوں کرنے دوں۔ حالانکہ نہ تو میرے پاس ضروری علم ہے اور نہ ہی وسائل۔ اب جو سافٹ ویئرز سامنے آ رہے ہیں وہ اس وجہ سے بھی سامنے آ رہے ہیں کہ ان کو چلانے والے کمپیوٹر آ چکے ہیں۔ میں نے پہلے بھی اس کا جواب دیا ہے 6 دسمبر 1979ء کو جب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے ساتھ ایک پریس کانفرنس میں نوری نستعلیق کا اعلان ہوا تو ایک صاحب نے سوال یا اعتراض کیا کہ یہ پہلے کیوں نہیں آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ اب جا کر کمپیوٹر اس قابل ہوا ہے کہ ہم اس پر نوری نستعلیق چلا سکیں تو یہ اس لیے اب آئی ہے۔ درحقیقت وہی وقت بھی کمپیوٹر کا بچپن تھا۔ اب تو ان کی حالت ہی بدل کر رہ گئی ہے۔ ان کی کام کرنے کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے اور ان میں اتنی سہولتیں مہیا کر دی گئی ہیں کہ آج سے چند سال پہلے بھی ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ 1979ء میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نوری نستعلیق پر آج جس طرح سے کام ہو رہا ہے، وہ ہو سکے گا بھی یا نہیں۔ اس وقت میں نے اخبارات کی بڑی ہیڈنگ کے بارے میں تجویز دی تھی کہ اسے ہاتھ سے کٹ پیسٹ کیا جائے تو اب یہ کام بھی کمپیوٹر کر رہا ہے۔ چند منٹ کے اندر اندر بڑی سے بڑی سرخی لکھی جا سکتی ہے اور بے حد دیدہ زیب انداز میں۔ اس بارے میں میں نے بھی نہیں سوچا تھا ہاں اس وقت میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ کمپیوٹر میں جتنی تیزی سے ترقی ہو رہی ہے، وہ سب آنے والے دور میں نوری نستعلیق کو ملے گی اور ایسا ہی ہوا۔ آپ دیکھیں کہ یہ سب ترقی ہمارے بس کی بات نہیں تھی اور پھر یہ سب چیزیں آپ کو مفت میں مل رہی ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ اب کمپیوٹر کی زبان ہی کو لیجیے۔ اب تک اردو میں کمپیوٹر کی کوئی زبان نہیں بنی ہے۔ جس سے ہم کمپیوٹر کے لیے اردو پروگرام تیار کر سکیں مگر دیکھیں انگریزی میں جتنے بھی کام ہو رہے ہیں اور جتنی بھی ترقی ہو رہی ہے وہ سب نوری نستعلیق کو مفت میں مل رہی ہے۔

کاشف زبیر: یعنی آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو سافٹ ویئرز جو ابھی ارتقائی مراحل میں ہیں۔ انہیں ترقی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اسے ہم انٹرنیٹ پر لائیں یا ڈیٹا بیس پروگرام میں بدل دیں؟

مرزا صاحب: نہیں میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ ورنہ ہر جگہ یہ کام ہو رہا ہے۔ دیکھیے مقتدرہ قومی زبان نے بھی اردو سافٹ ویئرز کے کئی مقابلے کرائے ہیں۔ اردو زبان۔۔۔اور اردو ڈیٹا بیس پروگراموں کے لیے بھی کام جاری ہے۔ اردو کی بورڈ اور کوڈ پلیٹ بنائی جا رہی ہے جو بین الاقوامی سطح پر استعمال ہوگی۔ ہمارے وفاقی وزیر سائنس ڈاکٹر عطا الرحمٰن نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے۔ آئے دن سیمینار اور مقابلے ہوتے ہیں۔ انعامات دیئے جاتے ہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ دیئے جا رہے ہیں جہاں تک نوری نستعلیق کا تعلق ہے یہ اردو کتابت میں اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ باقی اردو کے پروگراموں پر خاصی حد تک کام ہو چکا ہے۔ اب ضرورت صرف ان کو استعمال کرنے کی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اس سلسلے میں زور و شور سے کام جاری ہے۔ طلبا اس کے لیے خصوصی جدوجہد کر رہے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس شعبے میں بھرپور طریقے سے کام ہو رہا ہے اور یہ رکنے والا نہیں ہے۔ میں اسے نہیں کر رہا لیکن بہت سارے لوگ کچھ نہ کچھ کرنے کی فکر میں ہیں۔ کوئی اردو انگلش ڈکشنری بنا رہا ہے اور کوئی اردو میں ویب سائٹ تیار کر رہا ہے۔ ایک غریب ملک کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔ جو ہم نے اس شعبے میں کام کر کے حاصل کی ہے۔ ابھی تو اس

دنیا کے چند نامور

پڑھاکو اور حُفّاظ

احمد صغیر صدیقی

لارڈ ٹے نی سن..... انگریزی زبان کا مایۂ ناز شاعر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے اشعار کو عرصے تک ذہن میں بناتا بگاڑتا اور درست کرتا رہتا تھا اور جب وہ نوک پلک سے آراستہ ہوجاتے تھے تبھی وہ انہیں کاغذ پر منتقل کرتا تھا۔ اس کی اس عادت کی وجہ سے بہت سے اشعار غائب ہوجاتے تھے۔ وہ انہیں ذہن میں کافی دیر تک ڈالے رکھنے کی وجہ سے بھول جاتا تھا اور اسے یہ پھر یاد نہیں آتے تھے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

ہمیں اس قسم کے بہترین حفّاظ میں بہت سی اسلامی شخصیات بھی ملتی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے 'وہ لاتعداد احادیث اور بہت سی کتابوں کے حوالے صرف اپنی یادداشت سے جب چاہتے تھے 'کاغذ پر اتار دیتے تھے یا اپنی تقریروں میں کوٹ کرتے تھے۔ ان شخصیات میں مشہور دینی شخصیت امام ابوحنیفہؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا نام لیا جاتا ہے۔

شعبے میں یہ بھی بہت ہے۔ جس روز اردو سرکاری زبان ہوگئی تو اس شعبے میں بھی انقلاب آجائے گا۔ اردو کی پرواز ہی کچھ اور ہوجائے گی۔ ابھی تو لوگ بغیر کسی نفع و لالچ کے کام کررہے ہیں۔

کاشف زبیر: ابھی اردو سافٹ ویئرز کی مارکیٹ نہیں ہے۔

مرزا صاحب: مارکیٹ تو بنتی ہے آہستہ آہستہ۔ جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بازار میں یہ چیز مل رہی ہے اور ہمارے ہاں لوگ مفت میں حاصل کرنے کے زیادہ قائل ہیں۔ پیسہ خرچ نہیں کرتے۔ اب میرے بیٹے نے کمپنیز کے لیے جو سافٹ ویئر بنائے۔ وہ اسے استعمال کررہے ہیں بغیر کسی رائلٹی کے۔ بلکہ کاپی کرکر کے دوسروں میں بھی بانٹتے ہیں۔ اب فرض کریں کہ اس کا کاپی رائٹ ہے بھی تو ہمارے ہاں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ نوری نستعلیق کا معاملہ لیجیے۔ جس کا دل چاہا اس نے اسے لے لیا اور بلا تکلف اپنے پروگراموں میں استعمال شروع کردیا۔ میں نے روکنے کو نہیں سوچا کیونکہ یہ تو اردو کا فائدہ ہے اب کوئی بھی بنائے اور کوئی بھی چلائے اصل مقصد تو اردو کی ترقی ہے تو وہ ہورہی ہے۔

کاشف زبیر: اردو کمپوزنگ کے تقریباً ہر سافٹ ویئر میں آپ کا نوری نستعلیق فونٹ استعمال ہورہا ہے۔ آپ نے ان میں سے کس کو سب سے بہتر پایا؟

مرزا صاحب: ان پیج کا جو کام ہوا ہے اور اس نے جو ترقی کی ہے اب تو اس کا ٹو پوائنٹ سیون ورژن آگیا ہے۔ جو ہر لحاظ سے مکمل اور جدید ترین ہے۔ اس میں ہر شے موجود ہے۔ اخبارات کے لیے بھی، رسالوں کے لیے بھی اور پبلشرز کے لیے بھی۔ یہ سب سے بہتر ہے۔ اس سلسلے میں جنگ اخبار کی کاوشیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے اس میں ملٹی لینگول سے خاصے کام کرائے ہیں اور انہیں ادائیگیاں بھی کی ہیں۔ انہوں نے اس میں اخبار کے مطلب کی بہت ساری چیزیں بنا کردی ہیں۔

کاشف زبیر: اردو کے کوئی بھی فونٹ ہوں لیکن جب یہ انٹرنیٹ پر جاتے ہیں تو کام نہیں کرتے۔

مرزا صاحب: اس سلسلے میں بھی کام ہورہا ہے اب یہ جو اردو کی کوڈ پلیٹ بن رہی ہے تو اس کی مدد سے اردو بھی انٹرنیٹ پر زبان کی حیثیت سے جاسکے گی۔

نعمان احمد: جنگ نے اپنی ویب سائٹ پر رحمٰن فونٹ کے نام سے نیا فونٹ متعارف کرایا ہے لیکن ابھی تک اس نے کام نہیں کیا ہے۔

مرزا صاحب: ابھی تو یہ مکمل بھی نہیں ہوا ہے جب مکمل ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ انٹرنیٹ پر اردو ابھی تصویر کی صورت میں آرہی ہے یعنی یہ تحریر نہیں ہے جب اسے تحریر کی شکل میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ گڑبڑ کرتی ہے۔ نوری نستعلیق بھی تصویر کے طور پر آتا ہے اور بہت سارے تو اسے ایسے

ہی استعمال کرر ہے ہیں تصویر کے طور پر۔

کاشف زبیر: اس کا سائز بھی بہت بڑا کر سکتے ہیں؟

مرزا صاحب: وہ اب بھی ہے۔ مستقبل میں نہ جانے اس کا کیا حل نکلے ہم تو یہاں تک پہنچنے کا بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ ہم اردو میں ویب سائٹس دیکھیں گے۔ جیسے جیسے نئی چیزیں سامنے آتی ہیں' ان سے وابستہ مشکلات بھی آتی ہیں۔ ان کے حل نکلتے ہیں اور نئے راستے بنتے جاتے ہیں۔

کاشف زبیر: انٹرنیٹ پر مختلف زبانوں میں بے شمار لائبریاں دستیاب ہیں۔ ان کی بے شمار کیٹیگریز ہیں اور یہ لوگوں کو آن لائن پڑھنے کی سہولت فراہم کرتی ہیں لیکن اب تک کوئی اردو لائبریری سامنے نہیں آئی ہے اور نہ ہی کوئی اردو کتاب انٹرنیٹ پر شائع ہوئی ہے۔ جبکہ دوسری زبانوں میں بے شمار کتابیں آتی رہتی ہیں۔ ان کے ہاں کاپی رائٹ ہے۔ اگر کوئی کتاب شائع ہوتی بھی ہے تو اس کا نیٹ ایڈیشن فوراً نہیں آتا ہے۔ اب فرض کریں کہ ہمارے ہاں کوئی کتاب نیٹ پر شائع ہوتی ہے یا کسی نے ڈال دی تو اس میں کاپی رائٹ کا کیا ہوگا۔

مرزا صاحب: میں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس صورت میں کاپی رائٹ کا کیا ہوگا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی یہ ذرا دور کی بات ہے۔ ہاں اس سے یہ ہوگا کہ جو لکھنے والے ہیں وہ خود اپنی کتاب شائع کر سکیں گے اور پبلشر کے چکر سے بچ جائیں گے کیونکہ وہ تو انہیں بیچ کھاتا ہے۔ دس ہزار کا پیاں شائع کرتا ہے اور پیسے ہزار کے بھی نہیں دیتا اور بعد میں بھی ایڈیشن نکالتا رہتا ہے۔

کاشف زبیر: اس میں ایک قباحت اور بھی ہے۔ ایک پبلشر ہزاروں کا خرچہ کر کے ایک کتاب مارکیٹ میں لاتا ہے اور کوئی اسے نیٹ پر ڈال کر اسے سب کو دے سکتا ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں کاپیاں بنا سکتا ہے۔ بلکہ جتنی چاہے اس کی کاپیاں کسی کو دے سکتا ہے۔

مرزا صاحب: اس کا کوئی فائدہ بھی ہوگا؟

کاشف زبیر: سوال آپ نے شروع کر دیئے (قہقہہ) فائدہ تو ہوگا دیکھیے کامرس کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے اور .....اب ہر سال سات سو ارب ڈالرز کا کاروبار انٹرنیٹ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس میں کتابوں کا کاروبار بھی شامل ہے۔ ہزاروں ادارے ہیں جو یہ کاروبار کرر ہے ہیں خود پاکستان میں بے شمار ادارے ہیں۔

مرزا صاحب: انٹرنیٹ پر شائع ہونے والی کتاب کی ہارڈ کاپی ممکن ہے؟

کاشف زبیر: بالکل ممکن ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اپنے کمپیوٹر کی اسکرین پر پڑھ لیں یا پرنٹر سے پرنٹ کر کے ہارڈ کاپی کی شکل میں لا کے پڑھ لیں۔

مرزا صاحب: یہ تو خاصی سستی پڑتی ہوگی؟

کاشف زبیر: بالکل۔ اب دیکھیں پرنٹر اسے چھاپتا ہے۔ پبلشر سارے اخراجات برداشت کرتا ہے پھر اس پر ٹیکس بھی ادا کرتا ہے جبکہ نیٹ پر شائع کرنے میں ایسا تو جھمیلا نہیں ہے۔

مرزا صاحب: اس میں مصنف کو بھی کچھ ملے گا؟

کاشف زبیر: وہی جو اسے پبلشر دے گا۔ اگر وہ خود پبلش کرے تو بے شک سارا خود رکھ لے۔ اب آپ دیکھیں شباب نامہ ہمارے ہاں ایک اچھی ہارڈ کاپی کی صورت میں چار ساڑھے چار سو کا ملتا ہے اور کوئی اسے امریکا یا کینیڈا میں منگوانا چاہے تو اسے چالیس پچاس ڈالرز ادا کرنے پڑیں۔ سوچیے کہ اگر یہ نیٹ پر آ جاتا ہے تو اس کی کیا قیمت ہوگی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے جو لوگ پبلشنگ انڈسٹری سے تعلق رکھتے ہیں تو وہ دیوالیہ ہو جائیں گے۔ اگر ابھی سے اس معاملے میں کچھ نہ کیا گیا تو آئندہ بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب: تم نے بڑی اہم نشان دہی کی ہے۔ کاشف میاں میں کہتا ہوں کہ ساری پبلشنگ انڈسٹری کو اس پر مل کر غور کرنا چاہیے اور اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا چاہیے۔ ایسا حل جس میں سب کا بھلا ہو یعنی مصنف کا بھی پبلشر کا بھی اور پرنٹر کا بھی۔ خاص طور سے مصنف کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا ازالہ ہونا چاہیے ورنہ آئندہ ہوگا یہ کہ مصنف خود ہی کمپیوٹر پر لکھ کر اسے شائع کرنا شروع کر دے گا۔

کاشف زبیر: ایسا بھی ممکن ہے کیونکہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ بہت تیزی سے پڑھنے لکھنے میں آ رہے ہیں اور آج سے پانچ دس سال بعد یہ اس طرح ہماری زندگی میں شامل ہو جائیں گے جیسے ٹی وی کیبل ہے۔

یہاں تک آ کر ہمارا انٹرویو ختم ہو گیا۔ حالانکہ دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ انٹرویو ختم ہو۔ ہم سوال کرتے رہیں اور مرزا صاحب اپنے مخصوص شگفتہ لہجے میں جواب دیتے رہیں لیکن پھر سرگزشت کے محدود صفحات کا خیال آ گیا اور ہم شکریہ ادا کر کے مرزا صاحب کی رہائش گاہ ''النور'' سے نکل آئے۔